اکائی:1۔ سفرنامہ نگاری کا فن

ساخت:

1.1 اغراض مقاصد

1.2 تمہید

1.3 سفرنامہ نگاری: مفہوم وتعریف

1.4 سفرنامے کی اقسام

1.5 سفرناموں کی اہمیت

1.6 اردو کے چند اہم سفرنامہ نگار

1.7 خلاصہ

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

1.9 فرہنگ

1.10 معاون کتابیں

1.1 اغراض مقاصد

زیرنظر اکائی کے مطالعے کے بعد آپ جان جائیں گے کہ :

☆ سفرنامہ کسے کہتے ہیں اور اس کی صحیح تعریف کیا ہے،

☆ سفرنامے کی مختلف اقسام کیا ہیں یعنی ہم موضوعات کے لحاظ سے سفرناموں کو کتنے زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں،

☆ اردو کے اہم سفرنامے کون سے ہیں اور ان کی خصوصیات کیا ہیں،

☆ کسی بھی زبان کے سرمایۂ ادب میں سفرناموں کی کیا اہمیت ہے وغیرہ۔

1.2 تمہید

حرکت وعمل انسانی فطرت وطبیعت کا خاصہ ہے۔ انسان کسی ایک جگہ ٹک کرنہیں بیٹھ سکتا اور نہ ہی اسے ایسا کرنا چاہئے کیونکہ انسان کی تمام تر ترقی وکامرانی اسی وجہ سے ممکن ہوئی کہ اس نے تلاش وتحقیق کو اپنے مزاج وفکر کا حصہ بنایا۔

munotes.in

اس نے اسی تلاش وتحقیق کے لیے سفر اختیار کیا اور دور دراز کے ملکوں اور خطوں میں جا کر اپنی معاش کے ذرائع بھی مہیا کیے اور اپنی معلومات میں اضافہ بھی کیا۔ اب اس سیر وسیاحت کے بعد اس کے دل میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ جو کچھ اس نے دیکھا اور جانا ہے، اس سے دوسروں کو بھی واقف کرائے۔ اس کی یہی خواہش سفر ناموں کی تخلیق کا سبب بنی۔ سفر نامے دنیا کی تقریباً سبھی زبانوں میں موجود ہیں، اردو زبان بھی ان سے محروم نہیں ہے اور اردو میں بھی کئی اہم اور قابل قدر سفر نامے تحریر کیے گئے ہیں۔ ذیل میں ہم انہی سفر ناموں پر گفتگو کریں گے۔

1.3 سفر نامہ نگاری: مفہوم وتعریف

سفر نامہ کی اصطلاح عربی زبان کے لفظ سفر اور فارسی زبان کے لفظ نامہ کا مرکب ہے۔ فرہنگ آصفیہ کے مطابق:

'سفر نامہ (ع+ف) اسم مذکر: معنی سیاحت نامہ، سفر کی کیفیت، روز نامچۂ سفر، حالات وسرگزشت سفر۔'

(فرہنگ آصفیہ جلد دوم، صفحہ 1168)

انگریزی زبان میں سفر نامہ کے لیے لفظ Travelogue مستعمل ہے۔ آکسفورڈ انگلش اردو ڈکشنری کے مطابق:

'سفر کے مناظر پر مبنی فلم یا تصویروں کے ساتھ بیان۔'

(آکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، صفحہ 1873)

متذکرہ بالا لغات میں سفر نامے کے جو معنی بیان ہوئے ہیں اس کے مطابق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سفر نامہ دوران سفر چشم دید حالات وواقعات کا تحریری بیان ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ سفر نامے کا تعلق عام سفر سے نہ ہو کر اس سفر سے زیادہ ہے جو بغرض سیر وسیاحت اختیار کیا جائے یا پھر اس سفر کا دوسرا اور کوئی مقصد ہو مثلاً سفر حج یا مقامات مقدسہ کی زیارت وغیرہ۔ اس طرح کا سفر اختیار کرنے والا دوران سفر اور پھر منزل پر پہنچ کر دوران قیام جن چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور جس قسم کی کیفیات وتاثرات سے دوچار ہوتا ہے اس کا تحریری بیان ''سفر نامہ'' کہلاتا ہے۔ اردو میں ''سفر نامہ'' کی اصطلاح پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر مجید بیدار رقم طراز ہیں:

''اردو کی بیشتر نثری اصناف کا تعلق عربی اور فارسی زبان سے ہے۔ شعری ونثری اصناف میں یہ خصوصیت دیکھی گئی ہے کہ عام طور پر مفرد لفظ کے ذریعے صنف کا

munotes.in

تعین اور اس کے فن کی نمائندگی پر توجہ دی جاتی ہے۔لیکن اردو نثر میں استعمال ہونے والی صنف سفر نامہ مرکب الفاظ پر مبنی ہے جس کے مطابق سفر کا لفظ عربی سے مستعار لیا گیا ہے۔لیکن اس سے جڑا لاحقہ نامہ درحقیقت فارسی زبان کا جز ہے۔ اس طرح سفر نامہ کو مرکب لفظ کی نمائندگی کرنے والی اصطلاح کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔''

(اردو کی شعری ونثری اصناف،صفحہ 173)

پروفیسر مجید بیدار نے سفر نامہ کو ایک مرکب اصطلاح قرار دیا ہے کیونکہ یہ اصطلاح دو الفاظ''سفر'' اور''نامہ'' پر مشتمل ہے۔ چونکہ یہ اصطلاح اردو کی ایک اہم نثری صنف کا احاطہ کرتی ہے جس کا موضوع سفر اور اس کے دوران پیش آئے حالات وواقعات اور سفر کرنے والے کے مشاہدات وتجربات کی روداد ہے اس لیے اس کی رعایت سے''سفر'' کے ساتھ لفظ''نامہ'' کا اضافہ انتہائی مناسب ہے۔ ایک سفر نامہ اسی وقت کامیاب ہوگا جب وہ سفر کرنے والے کی قوت مشاہدہ سے ہمیں واقف کراتا ہو۔ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''سفر نامہ ایک صنف ادب ہے جس میں مشاہدے کی قوت سب سے زیادہ عمل میں آتی ہے۔ یہ صنف علم تاریخ اور علم جغرافیہ کے معنی مقاصد جس کا نکتہ انداز میں کوائف جمع نہیں کرنے بلکہ ایک مربوط اور دلکش اور خوشگوار بیانیہ قربت کرنے کے لیے سب سے ضروری ہے۔ سفر نامہ نگار اپنے عہد کو زندہ حالت میں دیکھتا ہے۔اور زندگی کے اس مشاہدے کو سفر نامے میں یوں منتقل کر دیتا ہے کہ آنے والا زمانہ اس دور کی روح کو تحریف محسوس کر لیتا ہے۔''

(اردو ادب میں سفر نامہ،صفحہ 226)

ڈاکٹر خالد محمود لکھتے ہیں:

''سفر نامہ کس مخصوص تکنیک یا کسی خاص اصول کا پابند نہیں۔سفر نامہ نگار کا مزاج اور تحریری برتاؤ سفر نامے کا اصول، اسلوب اور تکنیک ہے۔ایک اچھا تخلیق کار جب سفر نامہ لکھتا ہے تو اس کے تخلیقی تجربات سفر نامے کے لیے ایک ایسا اسلوب

واضح کر لیتے یں کہ جن کی سفر نامہ کوضرورت ہوتی ہے۔ یا وہ سفر نامے کے مطالبات کواپنے مخصوص طرز نگارش کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔گویا سفر نامہ نگار آزاد ہے کہ جس طرح چاہے تجربات سفرتحریر کرے۔مگر یہ خیال ضرور ہے کہ سفر نامے کوسفر نامہ ہی رہنے دیں۔ داستان، ناول یا افسانہ بنانے کی کوشش نہ کریں۔"

(اردوسفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ،صفحہ 23)

سفر نامے کی تعریف مختلف ادبا نے مختلف طریقے سے کی ہے۔کچھ نے تو اسے ام الاصناف تک کہا ہے کیوں کہ سفر نامہ ایک ایسی ادبی صنف ہےجس کے سلسلے تمام اصناف ادب سے ملتے ہیں۔ بہرحال سفر نامہ کسی بھی سفر کی ایک ایسی روداد کا نام ہے جوتجربات ومشاہدات پر مشتمل ہوتی ہے اوراس نقطۂ نظر سے اس کی بے انتہا اہمیت وافادیت ہے کہ ہم کسی بھی اچھے سفر نامے کے ذریعے کسی جگہ،شہر، مقام اور خطے کی جغرافیائی صورت حال کے ساتھ وہاں کی تہذیب،زبان اور کلچر سے بڑی حد تک واقف ہوجاتے ہیں۔اگر سفر نامے کی زبان اوراسلوب بیان دلچسپ اور معلوماتی دونوں ہوتو ایسا سفر نامہ ایک اچھے اور کامیاب ادب پارے کی حیثیت سے کسی زبان کے ادب عالیہ کا ایک اہم جزوقرار پاتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

1۔سفر نامے کوانگریزی میں کیا کہتے ہیں؟

2۔سفر نامے کوایک مرکب اصطلاح کس نے قرار دیا ہے؟

3۔سفر نامے کوام الاصناف کیوں کہا جاتا ہے؟

1.4 سفر نامے کی اقسام

اردو میں سفر ناموں کا آغاز عام طور سے انیسویں صدی کے نصف آخر سے ہوتا ہے۔اس دور میں بہت سے اہم سفر نامے منظر عام پر آئے۔ چونکہ یہی وہ زمانہ ہے جب نقل وحرکت کے مختلف ذرائع کی وجہ سے سفر کے لیے بہت سی سہولتیں پیدا ہوئیں۔راستے نسبتاً محفوظ ہو گئے اور ہوائی سفر اور بحری سفر کے لیے جہازوں کی سہولت بھی فراہم ہوگئی جس کے سبب سے دور دراز کا سفر بھی لوگوں کے لیے آسان ہوگیا۔چونکہ سائنسی ترقی کے باعث ذرائع ابلاغ میں بھی اضافہ ہوا اور دنیا کے مختلف علاقوں اور خطوں کے تعلق سے بھی لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوااس لیے سفر کا شوق اور جذبہ بھی پیدا

munotes.in

ہوا کیونکہ انسان کی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ نئی نئی چیزوں کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے۔یہی وہ جذبہ تھا جس نے لوگوں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے ملک یا علاقے سے باہر نکلیں اور نئے تجربات ومشاہدات سے اپنی معلومات میں اضافہ کریں۔سفر تو بہتوں نے کیا لیکن اپنے سفر اور اس کے دوران ہوئے تجربات سے دوسروں کو کچھ لوگوں نے ہی واقف کرایا۔جن لوگوں نے یہ کام کیا ان کی کاوشیں سفرناموں کی صورت میں سامنے آئیں۔اردو میں ایسے سفرناموں کی قابل قدر روایت موجود ہے۔ یہ سفرنامے چار زمروں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں:

1۔یورپ کے سفرنامے

2۔مذہبی سفرنامے

3۔مشرقی سفرنامے

4۔مقامی سفرنامے

1۔ یورپ کے سفرنامے

جب ملک میں انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو ان کے ہمراہ نئی فکر،نظریات اور ایجادات کا ہندوستان میں چلن ہوا نغربی ممالک خاص طور پر برطانیہ کے بارے میں معلومات عام ہوئیں۔تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں بھی یہ شوق پیدا ہوا کہ وہ اس نئی ملک کو دیکھے اور وہاں کی ترقی اور کامیابی کا مشاہدہ کریں۔ چونکہ یہی دور ہندوستان میں مختلف سماجی اور اصلاحی تحریکات کا دور بھی تھا اس لیے ان تحریکات سے وابستہ اہم افراد یورپ کی ترقی اور سائنسی پیش رفت کو دیکھ کر،اس کا شاہدہ کر کے ہندوستان میں بھی تبدیلی کے عمل کو رائج کرنا چاہتے تھے۔یہی وجہ ہے ک ہ یورپ کے کئی سفر اختیار کیے گئے۔خود سر سید کا سفر لندن اسی مقصد سے عمل میں آیا تھا۔ یورپ کے ان سفرناموں کا اردو میں ایک خاص مقام ہے کیوں کہ ان کے مطالعے سے عام ہندوستانی کی معلومات میں بھی اضافہ ہوا اور سماجی تبدیلی کے عمل میں بھی تیزی آئی۔

2۔ مذہبی سفرنامے

جہاں تک اردو میں مذہبی سفرناموں کا سوال ہے تو یہ سفرنامے عام طور پر دو مقاصد کے تحت لکھے گئے ہیں، پہلا مقصد یہ ہے کہ دوران حج وزیارت سفرنامہ تحریر کرنے والا کن کیفیات وجذبات سے دوچار ہوا۔اور اسے ان مقامات کو دیکھ کر یا وہاں پہنچ کر جو سکون اور اطمینان حاصل ہوا اس سے اپنے قارئین کو واقف کرانا۔اسی کے ساتھ عام طور پر دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو ان مقامات کی زیارت کرنا چاہتے ہیں وہ بھی اس سفرنامے سے رہنمائی حاصل کرسکیں۔

munotes.in

دوران حج مختلف قسم کے مناسک حج ادا کرنے ہوتے ہیں حج و زیارت سے مستفیض ہونے والا اپنے ان تجربات کو بھی دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے تا کہ انھیں پہلے سے ہی واقفت ہو جائے اور وہ ان مناسک کو صحیح طریقے سے ادا کرسکیں۔ مذہبی سفرنامے عام طور پر حج عمرہ کے سفرنامے ہیں۔ان سفرناموں میں مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ کے بارے میں ہمیں اچھی خاسی تفصیل مل جاتی ہے۔ وہاں کی جغرافیائی صورتحال، موسم، شہر کی دیگر تفصیلات اور مسجد حرم اور مسجد نبوی کے ساتھ ساتھ دوسرے اہم مقامات مثلاً صفا و مروہ، میدان عرفات، جنت البقیع، جبل احد اور غار حرا وغیرہ کے مکمل کوائف ہمیں ان سفر ناموں میں مل جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جس قسم کے جذبات و احساسات سے حج پر جانے والا سرشار ہوتا ہے وہ کیفیت بھی قاری تک پہنچتی ہے اور خود اس کے دل میں سفر حج کی آرزو بیدار ہو جاتی ہے۔ سفر حج پر جانے والوں میں سے جن لوگوں نے کئی اور مما لک میں موجود مقامات مقدسہ مثلاً کربلا، نجف اشرف اور بغداد وغیرہ کی روداد بھی قلم بند کی ہے وہ بھی ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہے۔ دوران حج و زیارت قیام و طعام کی جو سہولتیں وہاں مہیا ہوتی ہیں۔ یا دوسرے اخراجات کے بارے میں بھی اہم معلومات یہ سفرنامے فراہم کرتے ہیں۔

3۔ مشرقی سفرنامے

اردو سفرناموں کے تعلق سے جب ہم ان سفرناموں کا ذکر کرتے ہیں جو ایران، مصر و شام قسطنطنیہ اور وسط ایشا کے مختلف ملکوں کے سفر کی روداد پر مشتمل ہیں تو ہم انھیں مشرقی سفرناموں کے زمرے میں رکھتے ہیں۔ یہ سفرنامے عام طور پر خالص سیاحت کے نقطہ نظر سے کیے گئے سفر کی روداد پر مشتمل ہوتے ہیں ان میں جن مما لک کا سفر اختیار کیا گیا ہے اس کی تہذیب، زبان، معیشت، سماجی و معاشرتی خصوصیات، طرز حکومت، تجارتی موضوعات، رہن سہن او ور دیگر اہم امور سے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ ان میں بعض مما لک وہ بھی ہیں جن سے ہندوستان کے قدیم تہذیبی، سیاسی اور تجارتی تعلقات رہے ہیں۔ ماضی میں کچھ سفر ان ملکوں میں موجود اہم کتب خانوں سے علمی استفادے کے لیے بھی کیے گئے۔ علامہ شبلی نعمانی کا تحریر کردہ سفرنامہ ''سفرنامہ رُوم مصر و شام'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا محمد حسین آزاد کا سفرنامہ ''سیر ایران'' بھی مشرقی سفرناموں میں تلاش و تحقیق کے نقطۂ نظر سے ایک اہم سفرنامہ ہے۔

4۔ مقامی سفرنامے

اندرون ملک کیے گئے سفر کی روداد پر مشتمل سفرناموں کو مقامی سفرنامہ کہا جاتا ہے۔ ان سفرناموں میں ہندستان کے مختلف علاقوں کی تہذیب، زبان، رہن سہن وغیرہ کے تعلق سے اہم معلومات ہمیں ملتی ہیں۔ ہندوستان ایک انتہائی

قدیم تاریخ کا حامل ملک ہے جہاں مختلف ادوار میں مختلف قومیں دنیا کے الگ الگ علاقوں سے آ کر آباد ہوئی ہیں۔ ان کے اثرات اور مقامی اثرات سے مل کر جو عظیم ہندوستانی تہذب وجود میں آئی اسے ہم ''گنگا جمنی تہذیب'' کہتے ہیں۔ اس تہذیب کی شناخت اور اس سے واقفیت کے لیے ہندستان کے مختلف علاقوں کا سفر ضروری ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس ملک کے مختلف علاقے الگ الگ جغرافیائی صورتحال کے حامل ہیں۔ کشمیر کے برف پوش پہاڑ، راجستھان کا ریگستان، میدانی علاقوں میں پھیلے ہوئے سبزہ زار اور دکنی علاقے کی پتھریلی سرزمین ہمیں ایک ہی ملک میں مختلف جغرافیائی صورتحال سے واقف کراتی ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار قدیم تاریخی عمارتیں بھی ہماری توجہ کا مرکز بنتی ہیں۔ مقامی سفرنامے ہمیں اسی رنگارنگ تہذیب سے واقف کراتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ مقامی سفرنامے ہندوستان کی تہذیبی تاریخ بھی مرتب کرنے میں ہم کردار ادا کرتے ہیں۔

سفرناموں کی ان اہم اقسام کے بعد کچھ اور طرح کے سفرناموں کا ذکر کرنا یہاں پر ضروری ہے۔ ان سفرناموں میں تعلیمی اور علمی سفرنامے، ادبی سفرنامے، سیاسی سفرنامے، تجارتی سفرنامے اور شاہی سفرنامے شامل ہیں۔ علمی اور تعلیمی سفرنامے ان لوگوں نے لکھے ہیں جنھوں نے تحصیل علم کے لیے مختلف ممالک کا سفر اختیار کیا۔ کہیں کہیں پر یہ سفرنامے الگ سے شائع نہ ہو کر سوانحات کا حصہ ہیں۔ مثلاً گاندھی جی نے اپنی خودنوشت ''تلاش حق'' میں دوران تعلیم لندن میں اپنے قیام کے شب و روز کا ذکر کیا ہے جس سے اس دور کے لندن کی تہذیبی و تمدنی زندگی کے بارے میں اہم معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ جہاں تک ادبی سفرناموں کا تعلق ہے یہ سفرنامے ان لوگوں نے تحریر کیے ہیں جنھوں نے سمینار یا کانفرنس یا دیگر ادبی سرگرمیوں مثلاً مشاعرہ وغیرہ میں شرکت کے لیے دوسرے ممالک کا سفر اختیار کیا۔ کاروباری یا تجارتی نوعیت کے سفرنامے ان لوگوں کے تجربات کا نتیجہ ہیں جو بغرض تجارت غیر ممالک کا سفر کرتے ہیں۔ سیاسی رہنماؤں کے سفرناموں کو سیاسی سفرنامہ اور حکمران وقت کے سفرنامے کو شاہی سفرنامہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

1۔ اردو سفرناموں کے نقطۂ نظر سے کون سی صدی زیادہ اہم ہے؟

2۔ محمد حسین آزاد کے سفرنامے کا عنوان کیا ہے؟

3۔ مقامی سفرنامہ کسے کہتے ہیں؟

1.5 سفرناموں کی اہمیت

سفرناموں کو ہم معلوماتی ادب کا ایک اہم حصہ قرار دے سکتے ہیں۔ایک اچھا سفرنامہ ہمیں مسافر وسیاح کے ذوق تجسس کے ساتھ ساتھ کتنی ہی نئی جگہوں، مقاموں، شہروں، ملکوں اور خطوں کی زبان، معاشرتی وسماجی خصوصیات، تہذیب ،زبان، لباس اور طرز حیات سے روشناس کراتا ہے۔ اگر عصری سفرنامے ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہیں تو صدیوں پہلے لکھے گئے سفرنامے تاریخ نویسی کے نقطۂ نظر سے ایک انتہائی اہم تاریخی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔آج بھی ہندوستان کی سیاسی و تہذیبی تاریخ کا مطالعہ ایران و ترکستان، چین ومنگولیا اور برطانیہ و فرانس سے آنے والے سیاحوں کے تحریر کردہ سفرناموں کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔ برنیر، فاہیان، منوچی، ابن بطوطہ وغیرہ کے سفرنامے تاریخ کے مطالعے کے نقطۂ نظر سے ایک مستند حوالے کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ مذہبی مقامات سے متعلق سفرنامے نئے زائرین وعازمین سفر کے لیے انتہائی کارآمد ہوتے ہیں کیونکہ ان کے مطالعے سے بہت سی مفید معلومات پہلے ہی مل جاتی ہیں۔ جولوگ حج وعمرہ یا دوسرے مقامات مقدسہ کی زیارت کے لیے جاتے ہیں انہیں ان سفرناموں سے بہت مدد ملتی ہے۔دوسرے ملکوں کے تعلیمی اداروں کے سفر سے متعلق سفرنامے نئے طالب علموں کے لیے مشعل راہ کا کام دیتے ہیں۔

ہر دور میں سفر کی اپنی دشواریاں رہی ہیں۔آج کی مادی ترقی نے ان دشواریوں کو بہت کم کردیا ہے لیکن اس کے باوجود بہت سے مقامات سے متعلق معلومات ہمیں اسی وقت حاصل ہوسکتی ہیں جب ہم خوداس جگہ کا سفر اختیار کریں ۔اگر سفر سے پہلے ہمیں ان مسائل کا اندازہ ہوتو زیادہ بہتر طریقے سے ہم سفر کی تیاری کرسکتے ہیں۔سفرنامے اس سلسلے میں ہماری خاص مدد کرتے ہیں ہمیں ان کے مطالعے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ راہ میں کیا مشکلات پیش آنے والی ہیں اوران سے بچنے یا انہیں حل کرنے کے لیے ہمیں کیا تیاری کرنی ہوگی۔

munotes.in

اپنے مطالعے کی جانچ

1۔معلوماتی ادب کا اہم حصہ ہم کسے قرار دیتے ہیں؟

2۔مذہبی سفرناموں سے کیا مراد ہے؟

3۔تاریخ نویسی کے نقطۂ نظر سے سفرنامے کیوں اہم ہیں؟

1.6 اردو کے چند اہم سفر نامہ نگار

ا۔ یوسف خان کمبل پوش (تاریخ یوسفی المعروف بہ عجائبات فرنگ)

اردو کا اولین سفر نامہ یوسف خاں کمبل پوش کا سفر نامہ ''تاریخ یوسفی المعروف بہ عجائبات فرنگ'' ہے جو پہلی مرتبہ 1847 میں دہلی سے شائع ہوا۔ دوبارہ اس کی اشاعت ''عجائبات فرنگ'' کے نام سے 1973ء میں نول کشور پریس سے ہوئی ۔ یوسف خان کمبل پوش کا آبائی وطن حیدرآباد تھا۔ انہیں سیر و سیاحت کا شوق تھا اور اسی شوق کے تحت وہ ہندوستان کے مختلف شہروں مثلاً عظیم آباد، ڈھاکہ، کلکتہ وغیرہ کا سفر کرتے ہوئے 1828ء میں لکھنؤ پہنچے اور نواب نصیر الدین کی فوج میں ملازم ہو گئے ۔ پہلے جمعدار کے عہدے پر فائز ہوئے اور جلد ہی صوبہ دار بن گئے ۔ انگریزوں سے دوستی کے سبب انگریزی زبان سے دلچسپی پیدا ہوئی اور اس زبان کو سیکھ بھی لیا۔ لکھنؤ میں آٹھ سال رہنے کے بعد کلکتہ کے راستے سے 30 مارچ 1837 کو انگلستان کا سفر کیا۔ اسی سفر کے مشاہدات پر مبنی سفر نامہ بعنوان ''عجائبات فرنگ'' تحریر کیا جس کے آغاز میں ''مولف حال'' کے زیر عنوان اپنا تعارف کچھ اس طرح کرایا ہے۔

> ''یہ فقیر پیچ 1828 بمطابق 1246ھ کے حیدرآباد وطن خاص اپنے کو چھوڑ کر عظیم آباد، ڈھاکہ، مچھلی بندر، مندرراج، گورکھپور، نیپال، اکبرآباد، شاہجہاں آباد وغیرہ کو دیکھتا ہوا بیت السلطنت لکھنؤ میں پہنچا، یہاں بہ مددگاری نصیبے اور یاوری کپتان ممتاز خان میکنس صاحب بہادر کی، ملازمت نصیر الدین حیدر بادشاہ سے عزت پانے والا ہوا۔۔۔۔۔۔ ناگہاں شوق تحصیل علم انگریزی کا دامن گیر ہوا۔ بہت محنت کر کے تھوڑے دنوں میں اسے حاصل کیا۔ بعد اس کے بیشتر کتابوں تواریخ کی سیر کرتا دیکھنے حال شہروں اور راہ و رسم ملکوں سے محظوظ ہوتا۔ ایک بارگی سن اٹھارہ سو چھتیس عیسوی میں میرا دل طلبگاری سیاحی جہاں خصوصاً ملک انگلستان ہوا۔۔۔۔۔ جمعرات کے دن 30 مارچ کے مہینے سن اٹھارہ سو سینتیس عیسوی میں جہاز پر سوار ہو کر بیت السلطنت انگلستان کو چلا، نام جہاز کا ازبیلا (Isabela) ۔ کپتان اس کا نام ڈبیڈ براں صاحب مع اپنی بیوی کے تھا۔''

(عجائبات فرنگ، ص403)

مذکرہ بالا سفر نامے میں یوسف خاں کمبل پوش نے انیسویں صدی کے لندن کی بہترین عکاسی ہے۔ لندن پہنچ کر انھوں نے جو کچھ دیکھا اسے اپنے مشاہدے کا حصہ بنا لیا اور بلا کسی جھجھک کے اس کا بیان کر دیا۔ ''اعجائبات فرنگ'' اس

وقت کے لندن کی سماجی، سیاسی، معاشرتی، تعلیمی، تہذیبی، سائنسی، صنعتی اور ادبی صورت حال کا دلچسپ بیان ہے۔لندن پہنچ کر وہ ہر وقت حیرت و استعجاب میں رہتے ہیں۔کبھی بچوں کی طرح خوش ہوتے ہیں کبھی حیران۔خوبصورت مناظر، حسین لوگ اور خاص طور پر حسین عورتوں کو دیکھ ان پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کوانھوں نے من وعن پیش کر دیا ہے۔وہ بنیادی طور پر حسن پرست ہیں اوراس جذبے کا اظہاراس سفر نامے میں بار بار ہوا ہے۔یوسف کبل پوش کی قوت مشاہدہ قوی اوران کی نظر باریک بین ہے۔وہ انگلستان سے بے حد مرعوب اور بحیثیت ہندوستانی اکثر موقعوں پر احساس کمتری کا شکار نظر آتے ہیں۔یورپ کی قدیم عمارتوں، لباس، رہن سہن، سڑکوں، ہوٹلوں، کتب خانوں، اسکولوں، عجائب گھروں، علم دوستی، سماجی و سیاسی صورت حال کو دیکھ کر حیرت زدہ بھی ہوتے ہیں۔ملکہ وکٹوریہ کی تاج پوشی کا جلوس، چلتی ہوئی ریل گاڑیاں، ہوائی جہاز کی ابتدائی کوششیں انھیں بہت متاثر بھی کرتی ہیں اور حیران بھی۔یہی وجہ ہے کہ وہ جگہ جگہ یورپ سے ہندوستان کا موازنہ کرتے نظر آتے ہیں۔چونکہ وہ خود اودھ کی سرکار میں ایک اہم عہدے پر فائز تھے اور انھوں نے ہندوستان کے بہت سارے شہروں کا سفر بھی کیا تھا لہٰذا ان کا مشاہدہ بھی خاصا قوی تھا۔وہ ہندوستان کی پسماندگی اور بدحالی پر افسوس بھی کرتے ہیں اور انگلستان کی ترقی سے متاثر بھی ہوتے ہیں۔یوسف کمبل پوش نے اس سفر نامے میں لندن، پیرس، مصر اور دیگر عرب ممالک کے سفر کا بھی بیان بھی کیا ہے۔

عجائبات فرنگ اردو کا سب سے پہلا سفر نامہ ہے۔اس سفر نامے کی زبان رواج زمانہ کے مطابق ہے۔عبارت مقفع و مسجع ہے اور تحریر کو دلکش ادبی جملوں سے جا بجا سجایا گیا ہے۔یوسف کمبل پوش بیان کی رنگینی اور مشاہدے کی گہرائی کے ذریعے قاری کو وہ سب کچھ دکھا دینا چاہتے ہیں جسے انہوں نے خود دیکھا ہے۔

۲۔ سر سید احمد خان (مسافران لندن)

سر سید کی بنیادی حیثیت اس مصلح قوم اور ماہر تعلیم کی ہے جو ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو جدید تعلیم کا حامل دیکھنا چاہتے تھے۔یورپ کی مادی ترقی سے وہ متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ ہندوستان میں بھی اسی طرح کی ترقی ہو لیکن اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ یہاں مغربی تعلیم خصوصاً انگریزی زبان کو رائج کیا جائے۔وہ مغرب خاص طور پر انگلستان کہ علمی و سائنسی ترقی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے اور اسی لیے انھوں نے انگلستان کا سفر اختیار کیا۔لندن کے دوران قیام انھوں نے وہاں کے ترقی یافتہ معاشرے کو قریب سے دیکھا۔وہ لندن کے اعلیٰ تعلیمی اداروں مثلاً آکسفورڈ اور کیمرج یونیورسٹی کو دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے اور یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کے قوم کے بچے اسی طرح کی اعلیٰ درسگاہوں سے پڑھ کر نکلیں۔لندن سے واپسی پر انھوں نے اپنے مشاہدات کو مسافران لندن کے عنوان سے ایک سفر نامے کی

صورت میں تحریر کیا۔سر سید انگلستان کی تہذیب، سماجی ومہذبی رواداری اور اخلاق ومعاشرت کی تعریف اس سفر نامے میں بار بار کرتے ہیں۔انھیں یہ دیکھ کر اچھا لگا کہ مغرب کی خواتین بھی مردوں کے ساتھ ساتھ تحصیل علم میں مصروف ہیں۔ ڈاکٹر خالد محمود کے الفاظ میں:

''وہ (سر سید) اپنی قوم کو آگے بڑھتا دیکھنا چاہتے تھے اور یہ بات انھوں نے اچھی طرح محسوس کر لی تھی کہ ہمہ جہت ترقی اور کامرانی اور خوشحالی کا راز نئی تعلیم میں مضمر ہے۔قوم اگر تعلیم کی نعمت سے محروم رہی تو اس کا کوئی مستقبل نہیں، اسی فکر نے انہیں لندن میں بھی بے چین رکھا اور وہاں وہ ہمہ وقت قومی مسائل پر غور خوض کرتے رہے۔''

(اردو میں سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ، پروفیسر خالد محمود، ص 113)

سر سید کے بارے میں ڈاکٹر خالد محمود کے مندرجہ بالا خیالات بالکل درست ہیں۔سر سید بنیادی طور پر قوم کے ہر مسئلے کا سبب جدید طرز کی تعلیم سے اس کی دوری کو قرار دیتے تھے۔اگر آپ ''مسافران لندن'' کا مطالعہ کریں تو آپ کو سر سید کی اس مزاجی کیفیت کا اندازہ ہوگا۔انھوں نے اس سفر نامے میں کہیں بھی ادبی طرز عبارت اور اسلوب اظہار سے کام نہیں لیا ہے وہ سیدھی سادی زبان اور موثر جملوں میں اپنے دل کا درد اپنی قوم تک اس سفر نامے کے ذریعے پہنچا دیتے ہیں۔ان کی پوری زندگی قوم کے مسائل حل کرنے کے لیے وقف تھی۔ان کے پاس بیجا عبارت آرائی کا نہ موقع تھا اور اس کی ضرورت۔اسی سفر نامے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سر سید قوم کی تعلیم و تربیت کے لیے کس قدر فکر مند تھے۔

''میں ہم وطنوں سے پوچھتا ہوں کہ یہ لوگ آدمی ہیں یا ہم؟ جو صرف حیوانوں کی طرح اپنی خود غرضی میں مبتلا ہیں۔اور پھر صاحب ہمت ایسے ہیں کہ ہر ایک کام میں کہتے ہیں کہ گورنمنٹ بندوبست کر دے، لڑکیوں اور لڑکوں کے پڑھانے کا بندوبست بھی گورنمنٹ کرے۔افسوس صد افسوس! حقیقت میں ڈوب مرنے کی جگہ ہے۔''

(مسافران لندن، ص 174)

سرسید کے اس سفرنامے سے ان کی وہ مایوسی اور رنجیدہ دلی بھی سامنے آتی ہے۔ جو مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے سبب ان کے مزاج کا حصہ بن گئی تھی۔ وہ اس سفرنامے کے ذریعے اپنی قوم کے لوگوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ علم اور تعلیم کی کیا کیا برکتیں ہیں اور جب کوئی قوم علم کو اپنی زندگی میں داخل کر لیتی ہے تو پھر کامیابی اس کا مقدر کیسے بن جاتی ہے۔

مسافران لندن کے علاوہ سرسید نے ''سفرنامۂ پنجاب'' کے عنوان سے ایک اور سفرنامہ لکھا جو ان کے سفر پنجاب پر مبنی ہے۔ اپنے تعلیمی مقاصد سے انہوں نے 1884ء میں پنجاب کے مختلف شہروں کا دورہ کیا تھا اور وہاں کے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف توجہ دلائی تھی۔ سرسید کا یہ سفرنامہ بھی اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس کے مطالعے سے ان کی تعلیمی تحریک اور اصلاح معاشرہ کی ان کی کوششوں سے واقف ہونے میں ہمیں مدد ملتی ہے۔ سرسید کے یہ دونوں سفرنامے ہمیں ان کے زریں خیالات کے ساتھ ہی ان کی سادہ لیکن دل کو چھو لینی والی تحریر سے بھی روشناس کراتے ہیں۔

۳۔ محمد حسین آزاد (سیر ایران)

مولانا محمد حسین آزاد کو اردو کے سب سے بڑے انشا پرداز ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ شائد ہی ان کی مشہور تصنیف ''آب حیات'' سے بڑھ کر اردو شاعری اور ادب سے متعلق کوئی دوسری کتاب زیر بحث رہی ہو۔ آزاد مورخ بھی تھے، ادیب بھی اور شاعر بھی تھے۔ ان کی تصنیف ''دربار اکبری'' اردو میں تاریخ نویسی کا ایک اہم باب ہے۔ آزاد نے ایک علمی و تحقیقی مزاج پایا تھا۔ حقائق کی تہہ تک پہنچنا اور چھپے ہوئے علمی اور ادبی ذخیرے کو سامنے لانا ان کا مقصد حیات تھا اور اسی غرض سے انھوں نے 1886 میں ایران کا سفر کیا۔ ایران سے لوٹ کر انھوں نے دوران قیام وہاں کے تجربات و مشاہدات کو سفرنامے کی شکل میں مرتب کیا اور یہ کتاب ''سیر ایران'' کے نام سے شائع ہوئی۔ محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے جلسوں میں اپنے اس سفر کی روداد بیان کی جسے لوگوں نے بہت پسند کیا۔ وہ اگر اور زندہ رہتے تو اپنے قلم سے اس سفرنامے کی نوک و پلک درست کر کے شائع کرتے لیکن افسوس کہ اس کی اشاعت ان کے انتقال کے بعد ہوئی۔ آغا محمد طاہر نے اس کی جانب توجہ کی اور سفر ایران سے متعلق آزاد کا لکچر اور چند دوسری تفصیلات جو ادھر ادھر بکھری ہوئی تھی جمع کر کے یہ کتاب شائع کی۔ ایران کا یہ سفر آزاد نے ایک خاص علمی مقصد کے تحت اختیار کیا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ فارسی زبان کی ایک مکمل لغت تیار کریں۔ یہ کام بھی ان کی موت کے سبب ادھورا ہی رہا۔

واقعہ بیان کرنے میں آزاد کو کمال حاصل تھا۔ آج تحقیق کے بعد آب حیات میں درج کئی واقعات صحت کے لحاظ سے درست نہیں قرار دیے جا سکتے لیکن آزاد کے قلم کا جادو انھیں آج بھی جیتی جاگتی حقیقت بنائے ہوئے ہے۔ سفرنامہ ''سیر ایران'' کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ آزاد کے دلچسپ انداز بیان نے بہت سے مناظر کو ہمارے سامنے اس

طرح سے پیش کیا ہے جیسے ہم سفر میں ان کے ساتھ شریک رہے ہوں۔ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔

''میرے پاس پکانے کا سامان نہ تھا اس لیے بہت سی روٹیاں پکوا کر ساتھ لے لی تھیں۔ وہ پانچویں دن سڑ گئیں۔ انھیں سکھایا۔ ایک جگہ گدھا پانی میں بیٹھ گیا، وہ بھیگ گئیں۔ جہاں موقع ملا پھر پکوائیں اور دس دس پندرہ پندرہ دن سوکھی روٹیاں پانی کے گھونٹوں سے کھائیں۔''

(سیر ایران، ص 51)

ایک اور مثال دیکھئے:

''پچھلا پہرا تھا کہ ایک میدان میں اتر پڑے بوجھ اوپر تلے آگے پیچھے لگا کتابوں پر غدے ڈالے۔ آپ توکل خدا بیٹھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوا کہ پاؤں میں حس و حرکت نہیں۔ اٹھ کر ایک رفیق کو جگایا وہ غدوں میں گرم پڑا تھا۔ مگر اٹھا اور ادھر ادھر سے گھاس پھوس لے کر آگ جلائی کچھ دل بہلا، کچھ آگ کے نام سے سہارا ہوا، خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ سوکھے روکھے ٹکڑے چبائے ادھر ادھر پھرنے لگا۔''

(سیر ایران، ص 171)

زبان و بیان کی خوبیوں سے قطع نظر مندرجہ بالا اقتباسات کے مطالعے سے ہمیں اس دور میں سفر کی صعوبتوں اور تکالیف کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ عالم مسافرت میں اس وقت جو مسائل مسافروں کو درپیش ہوتے تھے۔ ان سے بھی ہماری واقفیت ہوتی ہے۔ محمد حسین آزاد کا انداز بیان اس قدر دلچسپ ہے کہ قاری اس کی روانی میں بہہ جاتا ہے۔ الفاظ میں کسی جگہ یا مقام، وقت یا عہد، ملک یا خطے کی حقیقی صورت گری و منظر نگاری انتہائی مشکل کام ہے لیکن آزاد کا قلم ہمیں ایسی جیتی جاگتی تصویریں دکھاتا ہے جیسے ہم یہ سب خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں۔ بقول انور سدید:

''سیر ایران کی خوبی اس کا خوبصورت اور دل آویز تخلیقی اسلوب ہے۔۔۔۔ان کی آنکھ نے جن مناظر کو دیکھا ان کی ڈرامائی تصویریں ان کے متخیلہ نے تیار کیں۔ ان کے اسلوب نے ان تصویروں کو تحرک و توانائی عطا کی۔''

(اردو ادب میں سفر نامہ، انور سدید، ص 156)

۴۔ علامہ شبلی نعمانی (سفر نامۂ روم ومصروشام)

علامہ شبلی نعمانی کی حیثیت ایک مورخ کی ہے ایک ایسا مورخ جس نے سیرت النبی کے عنوان سے پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت طیبہ پر انتہائی جامع اور مبسوط کتاب لکھی ہے۔سیرت النبی کے علاوہ الفاروق، المامون، الغزالی، الکلام اور شعرالعجم جیسی اہم کتابیں بھی ان کے قلم سے نکلیں۔سر سید تحریک کے زیر اثر اس بات کی بھی ضرورت محسوس کی گئی کہ مسلمانوں کو جدید علوم کی طرف راغب کرنے کے لیے انھیں ان کے موجودہ حالات کی خرابی اور ان کے درخشاں ماضی کی جانب بھی متوجہ کیا جایے۔شبلی نے اسی غرض سے مسلمانوں اور اسلام کی درخشاں تاریخ کو جدید اسلوب میں پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس کے لیے جس تاریخی مواد کی ضرورت تھی اس کی تلاش کے لیے انھیں مختلف ممالک کا سفر کرنا پڑا۔ان کا سفر نامہ جو'' سفر نامۂ روم ومصروشام'' کے نام سے معروف ہے انہیں سفروں کی روداد پر مشتمل ہے۔

شبلی نے اس سفر نامے میں ان تمام تفصیلات کو جمع کیا ہے جو ان مختلف ممالک کی تاریخ، تہذیب، سماج اور معاشرے کی خصوصیات نیز وہاں کے تعلیمی حالات وتحریکات سے متعلق تھے۔خود شبلی اس سفر نامے کی تصنیف کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''سفر نامہ لکھنے کا میرا ارداہ نہ تھا لیکن وہاں سے واپس آکر جن بزرگوں اور دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوا سب سفر نامے کے متقاضی تھے۔میں نے خیال کیا کہ چوں کہ ایک مدت سے ہماری جماعت میں سیر وسیاحت کا طریقہ بند ہے اور اس وجہ سے اسلامی ممالک کے صحیح حالات سے بالکل اطلاع نہیں حاصل ہوتی۔۔۔۔۔۔یہ اسباب تھے جنھوں نے مجھ کو ان اوراق پریشاں کی ترتیب پر آمادہ کیا۔''
>
> (سفر نامۂ روم ومصروشام،ص2)

شبلی کا یہ سفر طویل بھی تھا اور کئی ملکوں پر مشتمل بھی۔وہ مختلف کتب خانوں میں موجود تاریخی مواد کی تلاش میں نکلے تھے لیکن جب وہ ان ملکوں میں پہنچیں تو وہاں موجود مختلف تحریکات میں بھی ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کی۔اسی کا نتیجہ تھا کہ جب شبلی واپس آئے تو ان کے سماجی وسیاسی شعور میں ایک نمایاں تبدلی آ چکی تھی۔جس کی جھلکیاں بھی ہمیں اس سفر نامے میں ملتی ہیں۔شبلی کو ترکوں اور ان کی روشن تاریخ سے بھی خاص انسیت اور دلچسپی تھی۔اس وقت پورا عالم اسلام سلطنت عثمانیہ کے زیر نگیں تصور کیا جاتا تھا اور ترکی کے عثمانی خلیفہ کی عزت عام مسلمانوں کے دل میں بہت تھی۔خود اقبال

بھی ترکوں کے شاندار ماضی کا اعتراف واظہار اپنی شاعری میں کرتے نظر آتے ہیں۔شبلی کو ترکوں کا رہن سہن ،ان کی زبان، مہمان نوازی، سلیقہ مندی اور خوش اخلاقی سے خاص لگاؤ تھا جو اس سفر نامے میں بھی نظر آتا ہے۔ ایک مثال دیکھیے۔

> ''ترکوں کے اخلاق نہایت وسیع اور فیاضانہ ہیں۔غرور ونخوت،ترفع اور کم بینی ان میں نام کو نہیں۔ امیر وغریب،مزدور وعہدہ دار، جاہل و عالم ہر درجے کے لوگوں سے مجھ کو سابقہ پڑا لیکن خوش اخلاقی اور فیاض طبعی میں گویا سب ایک ہی مکتب کے شاگرد اور ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے تھے۔''

(سفر نامۂ روم ومصر وشام،ص100)

۵۔ سید احتشام حسین (ساحل اور سمندر)

سید احتشام حسین کا نام ترقی پسند تنقید کے بنیاد گزاراوں میں شامل ہے۔انھوں نے اشتراکی نقطۂ نظر کو بروئے کار لاتے ہوئے اردو کے قدیم و جدید نیز عصری شعری وافسانوی ادب کے ادبی وفنی پہلوؤں اور سماجی معنویت پر گفتگو کی ہے۔احتشام حسین ایک ایسے نقاد ہیں جو ایک مخصوص نظریۂ حیات رکھنے کے باوجود ادب کی تنقید اور تفہیم کے تعلق سے متوازن رویہ اختیار کرتے ہیں۔ان کی اہم تصانیف میں تنقیدی جائزے، روایت اور بغاوت، ادب اور سماج نیز اردو ادب کی تنقیدی تاریخ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔تنقید کے ساتھ انھوں نے''ساحل اور سمندر'' کے نام سے ایک سفر نامہ بھی لکھا ہے جو اردو سفر ناموں کی روایت کا ایک اہم باب ہے۔ یہ سفر نامہ ان کی قوت مشاہدہ اور باریک بینی کا واضح ثبوت ہے۔ وہ بغور مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر غور وفکر کے بعد اپنے مشاہدات کو قلم بند کرتے ہیں۔ جب انھوں نے امریکہ کا یہ سفر اختیار کیا تو خرابیٔ صحت کی وجہ سے ان کے اندر اس جوش وجذبے کا فقدان تھا جو عام طور پر کسی نئے سفر کے موقع پر مسافر کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''امریکہ کا سفر! اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے لیے تمام آسانیاں فراہم ہو جائیں، بادی النظر میں بے حد ول خوش کن موقع ہے لیکن میں اپنی افتادِ طبع کا کیا کہوں، میرے لیے نہیں ہے۔ رنج مجھے بے حد رنجیدہ کر دیتا ہے اور خوشیاں زیادہ خوش نہیں کرتیں۔''

(ساحل اور سمندر،ص43)

ایسا معلوم ہے کہ احتشام حسین نے امریکہ کا یہ سفر بہ حالت مجبوری اختیار کیا تھا۔ان کی تحریر میں وہ جوش وجذبہ

نظر نہیں آتا جو ایک مسافر کے دل میں اس وقت پیدا ہوتا جب وہ نئے نئے مقامات کو دیکھتا ہے یا ان کی سیر کرتا ہے۔ بہرحال امریکہ کا یہ سفر احتشام حسین کے لیے ان معنوں میں کارآمد ثابت ہوا کہ انھوں نے وہاں کی معاشرتی زندگی کو قریب سے دیکھا اور اس کی اہم خصوصیات سے واقف ہوئے۔ امریکہ کے پر رونق بازاروں، سجی ہوئی دوکانوں، تفریحی مقاموں، علمی و سائنسی اداروں، یونیورسٹیوں اور کتب خانوں کو دیکھنے کے بعد انہیں امریکہ کی ترقی اور اس کی سیاسی و معاشی طاقت کا اندازہ ہوا۔ ایک اشتراکی نظریہ ساز ہونے کے سبب ان کی ذہنی قربت سوویت یونین یعنی روس سے تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے امریکہ کی ترقی کو ستائشی نظروں سے دیکھا اور اس کی تعریف بھی کی۔ امریکہ کے سب سے اہم شہر نیویارک کے تعلق سے ان کا بیان ملاحظہ ہو۔

''یہاں زندگی کی رفتار بہت تیز ہے اور بڑے پیمانے پر کوئی شکل اختیار کر رہی ہے جسے میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں ۔۔۔۔۔ یہاں چیزوں کی فراوانی اور دولت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ناممکن ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علادین کے چراغ سے پیدا ہونے والے دیوزادوں نے رات کی تاریکی میں یہ بھاری بھرکم اور پر اسرار عمارتیں کھڑی کر دی ہوں گی۔''

(ساحل اور سمندر، ص96)

احتشام حسین نے اس سفر نے دوران محض ایک سیاح کے نقطۂ نظر سے امریکہ کے مختلف مقامات کی سیر نہیں کی بلکہ ایک حقیقت پسند مورخ و ناقد کی طرح وہاں کے داخلی احوال وکوائف سے بھی واقفیت حاصل کی۔ عام امریکی شہری بھی جس طرح ہر وقت امریکی مفادات کو نظر میں رکھتا ہے احتشام حسین اس کی تائید بھی کرتے ہیں اور تعریف بھی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتے ہیں۔

''اپنے ملک کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کوئی غیر اخلاقی بات نہیں لیکن دوسروں کی آرزوؤں اور زندہ رہنے کی خواہشوں کا خون کر کے ایسا کرنا کسی سنگ دل اور بے رحم افادی فلسفہ ہی کی رو سے جائز ہو سکتا ہے۔''

(ساحل اور سمندر، ص351)

یہ اقتباس ظاہر کرتا ہے کہ احتشام حسین ایک تنقیدی نقطۂ نظر سے امریکہ کی معاشرت اور امریکیوں کے سماجی رویے کو دیکھتے ہیں۔ وہ ایک عام سیاح کی طرح محض حسین و دلکش مناظر میں کھو نہیں جاتے بلکہ ان کے پس پردہ موجود حقائق تک بھی پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں تک اس سفر نامے کی زبان اور اسلوب کا تعلق ہے اس میں بھی وہی سادگی اور دلکش

پائی جاتی ہے جو ہمیں احتشام حسین کی دوسری تحریروں میں ملتی ہے۔ احتشام حسین کا یہ سفرنامہ اردو سفرناموں میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

1۔ محمد حسین آزاد نے ایران کا سفر کس سنہ میں کیا تھا؟

2۔ شبلی کو ترکوں کے کیا اوصاف پسند آئے؟

3۔ ساحل اور سمندر کس کا سفرنامہ ہے؟

1.7 خلاصہ

سفرنامہ کی اصطلاح عربی زبان کے لفظ سفر اور فارسی زبان کے لفظ نامہ کا مرکب ہے۔ انگریزی زبان میں سفرنامہ کے لیے لفظ Travelogue مستعمل ہے۔ مختلف تعریفات کے مطابق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سفرنامہ دوران سفر چشم دید حالات و واقعات کا تحریری بیان ہے یعنی سفر اختیار کرنے والا دوران سفر اور پھر منزل پر پہنچ کر دوران قیام جن چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور جس قسم کی کیفیات و تاثرات سے دوچار ہوتا ہے اس کا تحریری بیان ''سفرنامہ'' کہلاتا ہے۔

سفرناموں کو عام طور پر چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

1۔ یورپ کے سفرنامے　　2۔ مذہبی سفرنامے　　3۔ مشرقی سفرنامے　　4۔ مقامی سفرنامے

سماجی اصلاح پسندی کی مختلف تحریکات نے ہماری قوم کے مصلحین کو انگلستان کے سفر پر آمادہ کیا تاکہ یوروپی اقوام کی ترقی و کامرانی کے اسباب معلوم کیے جاسکیں۔ اس طرح کے سفرنامے ''یورپ کے سفرنامے'' کہے جاتے ہیں۔ مقامات مقدسہ کے لیے اختیار کیے گئے سفر کی روداد کو مذہبی سفرنامے کا نام دیا جاتا ہے۔ اگر سفرنامہ ایران، مصر و شام قسطنطنیہ اور وسط ایشا کے مختلف ملکوں کے سفر کی روداد پر مشتمل ہے تو ہم ایسے سفرنامے کو ''مشرقی سفرنامے'' کے تحت رکھتے ہیں۔ اندرون ملک کیے گئے سفر کی روداد پر مشتمل سفرناموں کو مقامی سفرنامہ کہا جاتا ہے۔ سفرناموں کی ان اہم اقسام کے بعد کچھ اور طرح کے سفرناموں کا ذکر کرنا یہاں پر ضروری ہے۔ ان سفرناموں میں تعلیمی اور علمی سفرنامے، ادبی سفرنامے، سیاسی سفرنامے، تجارتی سفرنامے اور شاہی سفرنامے شامل ہیں۔ ان سفرناموں میں ہندستان کے مختلف علاقوں کی تہذیب، زبان، رہن سہن وغیرہ کے تعلق سے اہم معلومات ہمیں ملتی ہیں۔

اردو کا اولین سفرنامہ یوسف خاں کمبل پوش کا سفرنامہ ''تاریخ یوسفی المعروف بہ عجائبات فرنگ'' ہے جو پہلی مرتبہ

munotes.in

1847 میں دہلی سے شائع ہوا۔ سرسید مغرب کی علمی و سائنسی ترقی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے تھے اور اسی لیے انھوں نے انگلستان کا سفر اختیار کیا۔ لندن سے واپسی پر انھوں نے اپنے مشاہدات کو مسافران لندن کے عنوان سے ایک سفر نامے کی صورت میں تحریر کیا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے چھپے ہوئے علمی اور ادبی ذخیرے کو سامنے لانے کے لیے 1886 میں ایران کا سفر کیا اور دوران قیام وہاں کے تجربات و مشاہدات کو سفر نامے کی شکل میں مرتب کیا اور یہ کتاب ''سیر ایران'' کے نام سے شائع ہوئی۔ شبلی نے مسلمانوں اور اسلام کی درخشاں تاریخ کو جدید اسلوب میں پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اس کے لیے جس تاریخی مواد کی ضرورت تھی اس کی تلاش کے لیے انھیں مختلف ممالک کا سفر کرنا پڑا۔ ان کا سفر نامہ جو ''سفر نامۂ روم و مصر و شام'' کے نام سے معروف ہے انہیں سفروں کی روداد پر مشتمل ہے۔

سید احتشام حسین نے ''ساحل اور سمندر'' کے نام سے ایک سفر نامہ بھی لکھا ہے جو ان کی قوت مشاہدہ اور باریک بینی کا واضح ثبوت ہے۔ وہ بغور مشاہدہ کرتے ہیں اور پھر غور و فکر کے بعد اپنے مشاہدات کو قلم بند کرتے ہیں۔

1.8 نمونہ امتحانی سوالات

(الف) مختصر جوابات کے حامل سوالات

۱۔ سفر نامے کی تعریف مختصراً بیان کیجئے۔

۲۔ سفر نامے کے تعلق سے پروفیسر خالد محمود کی رائے مختصراً تحریر کیجئے

۳۔ کیا سفر نامے کو ام الاصناف قرار دینا مناسب ہے؟ اپنی رائے کا اظہار کیجئے۔

۴۔ سفر نامے کی اقسام پر ایک نوٹ لکھئے۔

۵۔ سفر نامے ہمارے لیے کیوں اہم ہیں؟ مدلل اظہار خیال کیجئے۔

(ب) تفصیلی جوابات کے حامل سوالات

۱۔ یوسف خان کمبل پوش کے سفر نامے کی اہم خصوصیات کا جائزہ لیجئے۔

۲۔ سرسید کے سفر لندن کے کیا مقاصد تھے؟ ''مسافران لندن'' کے حوالے سے گفتگو کیجئے۔

۳۔ علامہ شبلی نعمانی کے سفر نامے ''سفر نامۂ روم و مصر و شام'' کے حوالے سے شبلی کے اسلوب اظہار کا جائزہ لیجئے۔

1.9 فرہنگ

زمرہ	گروہ، جماعت، ہمراہی	تحریک	منصوبہ بند طریقے سے کی جانے والی کوشش
افادیت	نفع یا فائدہ کی حامل	چشم دید	آنکھوں دیکھا
مصلحین	اصلاح کرنے والے	مرکب	ملا ہوا
مناسک	قربانی کی جگہ، کوئی خاص طریقہ	روزنامچہ	روز کی روداد، ڈائری
کوائف	کیفیت کی جمع	مستعار	مانگا ہوا، لیا ہوا
سوانح	پیش آنے والے واقعات	لاحقہ	کسی لفظ کے بعد آنے والا لفظ
تجسس	جستجو، تلاش	مفرد	تنہا، الگ

1.10 معاون کتابیں

1۔ اردو ادب میں سفرنامہ — ڈاکٹر انور سدید
2۔ اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ — ڈاکٹر خالد محمود
3۔ آزادی کے بعد اردو سفرنامہ — سعید احمد
4۔ اردو کے غیر مذہبی سفرنامے — ڈاکٹر بشریٰ رحمن
5۔ اردو سفرنامے: انیسویں صدی میں — ڈاکٹر قدسیہ قریشی
6۔ اردو سفرنامے کی مختصر تاریخ — ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

☆☆☆

munotes.in

اکائی: ۲۔ اردو سفر نامہ نگاری کا آغاز وارتقا

ساخت :

2.1 اغراض ومقاصد
2.2 تمہید
2.3 اردو میں سفرنامہ نگاری (ابتداء تا 1900ء)
2.4 بیسویں صدی میں اردو سفرنامہ
2.5 اردو سفرنامہ نگاری اور عصر حاضر
2.6 خلاصہ
2.7 نمونۂ امتحانی سوالات
2.8 فرہنگ
2.9 معاون کتابیں

2.1 اغراض ومقاصد

سفرنامہ اردو نثر کی غیر افسانوی ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ اردو میں سفرنامہ نگاری کا آغاز انیسویں صدی سے ہوا اور کئی سفرنامے لکھے گئے۔ جن میں مذہبی سفرنامے، ادبی سفرنامے، تعلیمی وعلمی سفرنامے، سیاسی سفرنامے، تفریحی سفرنامے وغیرہ ملتے ہیں۔ اس اکائی میں اردو میں سفرنامہ نگاری کے آغاز وارتقا پر اختصار کے ساتھ معلومات فراہم کی جارہی ہیں۔ اس کا مقصد طلباء کو سفرناموں کی اہمیت وافادیت سے واقف کروانا ہے۔

2.2 تمہید

ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانے کے عمل کو سفر کہتے ہیں۔ ''سفر'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مسافت طے کرنے یا مسافت قطع کرنے کے ہیں۔

انسان جب سے اس دنیا میں آیا ہے تب سے اب تک مسلسل حرکت میں ہے۔ یہ انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ یکسانیت سے جلد اکتا جاتا ہے۔ اُسے نئی چیزیں دیکھنے اور نئی باتیں جاننے کی خواہش ہوتی ہے اور یہی خواہش اُسے سفر کی

طرف مائل کرتی ہے۔قرآن مقدس میں سیروفی الارض سے عزم سفر کا حکم دیا گیا ہے۔سفر کے ذریعہ انسان کے مشاہدات اور تجربات میں اضافہ ہوتا ہے۔اس لیے سفر کو وسیلۂ ظفر یعنی کامیابی کی کنجی بھی کہا گیا ہے۔

محققین یونان کے مشہور مورخ 'ہیروڈوٹس' کو پہلا سفر نامہ نگار مانتے ہیں اور 'میگس تھنیز' کو ہندوستان کا پہلا سیاح مانتے ہیں جو چندر گپت موریہ کے عہد 330 ق۔م میں یونان سے ہندوستان آیا تھا۔اس نے اپنی کتاب 'انڈیکا' میں اپنے سفرِ ہندوستان کے حالات قلمبند کیے ہیں۔فاہیان اور ہیون سانگ چینی سیاح ہیں۔جنھوں نے ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ان کے سفر نامے قدیم ہندوستان کو جاننے کا بہت بڑا ذخیرہ ہیں۔

اس طرح عرب کا پہلا سیاح جس نے ہندوستان کی سیاحت کی ،وہ سلیمان تاجر ہے۔اس نے اپنا سفر نامہ 237ھ میں لکھا تھا۔ ناصر خسرو بلخی ،ابوریحان البیرونی ،ابن جبیر اندلسی اور شیخ ابوعبداللہ المعروف ابن بطوطہ وغیرہ مشہور عرب سیاح ہیں جنھوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے سفر کیے اور سفر نامے لکھے۔

یوروپی اقوام کی ہندوستان میں آمد کے ساتھ ہی سفر نامے لکھے ملتے ہیں۔مارکو پولو پہلا یوروپی سیاح تھا جس نے ہندوستان کی سیاحت 1265ء میں کی تھی۔برنیر' مشہور فرانسیسی سیاح مغل شہنشاہ شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آیا تھا۔اس کے بعد واسکوڈی گاما،نکولائی منوچی وغیرہ سیاحوں کے نام ملتے ہیں۔

ان سیاحوں نے اپنے سفر ناموں میں ہندوستان کی طرزِ معاشرت،تعلیم وتربیت،مختلف اقوام کے رسم و رواج، تہذیب و تمدن، سیاسی و انتظامی امور وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

2.3 اردو میں سفر نامہ نگاری (ابتداء تا 1900ء)

اٹھارویں صدی میں اردو کی کلاسیکی شعری اصناف نے کافی ترقی کر لی تھی اور نثری ادب کا دامن تقریباً خالی تھا۔فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد اردو نثر کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔مختصر مدت میں اس کالج میں بڑے پیمانے پر دوسری زبانوں کی داستانیں اردو میں ترجمہ ہوئیں۔ان داستانوں میں سفر کے تمام تام جھام موجود تھے اور یہی سفری داستانیں اردو سفر نامے کا خاکہ بنانے، راستہ ہموار کرنے اور سفر نامہ نگار کا ذہن تیار کرنے کا سبب بنیں اور انہیں سے حوصلہ پا کر اردو میں سفر نامہ نگاری کا آغاز ہوا۔

موجودہ تحقیق کے مطابق اردو سفر ناموں میں یوسف خاں کمبل پوش کا 'تاریخ یوسفی' جو 'عجائباتِ فرنگ' سے مشہور ہے اردو کا پہلا سفر نامہ کہلاتا ہے۔یوسف خاں کو عجائباتِ عالم دیکھنے کا بے حد شوق تھا۔مارچ 1837ء میں جہاز کے ذریعہ کلکتہ سے انگلستان کے سفر کے لیے روانہ ہوئے اور جولائی 1838ء کو کلکتہ واپس پہنچے۔اپنے سفر نامے میں

munotes.in

کمبل پوش نے وہاں کے لوگوں کی طرزِ معاشرت، لباس، عادات واطوار کے بیان سے زیادہ لندن، پیرس اور اسکندریہ کے تھیٹروں، سرکسوں اور قدیم عمارتوں کا ذکر زیادہ کیا ہے۔ یوسف خاں کمبل پوش کی زبان قدیم ہے اس کے باوجود سفرنامہ دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اپنے سفرنامے میں انہوں نے ریل گاڑی کا ذکر کیا ہے جو یوروپ میں جاری ہو چکی تھی اور ہندوستانیوں کے لیے نئی بات تھی۔ اپنے سفرنامے میں کمبل پوش نے ہوائی جہاز کی ابتدائی کوششوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ کمبل پوش جس زمانے میں انگلستان کے سفر پر روانہ ہوئے تھے اُسی برس برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ کی تاج پوشی ہوئی۔ اس جشنِ تاج پوشی کا حال اپنے سفرنامے میں انہوں نے تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔

نواب کریم خاں نے اپنے قیامِ لندن کے دوران جو کچھ محسوس کیا اُسے اپنی ڈائری میں درج کر لیا۔ بعد میں یہ 'سیاحت نامہ' کے نام سے شائع ہوا۔ نواب کریم خاں جھجّھر کے نواب خاندان سے تعلق رکھتے تھے وہ بہادر شاہ ظفر کے سفیر کی حیثیت سے جھجّھر کے ایک مقدمے کے سلسلے میں لندن گئے اور ڈسمبر 1840ء سے نومبر 1841ء تک وہاں مقیم رہے۔ اپنے سیاحت نامے میں انہوں نے لندن کی سماجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو بیان کیا ہے۔

'تاریخِ افغانستان' فدا حسین کا سفرنامہ ہے۔ جسے فدا حسین نے 1852ء میں لکھا۔ فدا حسین ایک سپاہی تھے۔ میرٹھ سے غزنی تک کے سفر کی روداد انہوں نے اپنے سفرنامے میں بیان کیں ہیں۔ فدا حسین کو زبان اور بیان پر زیادہ قدرت نہ تھی۔ اس کے باوجود اس سفرنامہ کے قدیم داستانی انداز اور پہلا اندرون ملک سفرنامہ ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

مولوی مسیح الدین اودھ کے نواب واجد علی شاہ کے معتمدینِ خاص میں شامل تھے۔ واجد علی شاہ نے انہیں اپنا سفیر بنا کر انگلستان روانہ کیا تھا۔ مولوی مسیح الدین نے قیامِ لندن کے دوران اپنے جو مشاہدات اور تجربات تھے اُسے سفرنامہ 'تاریخِ انگلستان' میں بیان کیے۔ ان کا یہ سفرنامہ 'سفرنامہ لندن' سے بھی مشہور ہے۔

مولانا جعفر تھانیسری نے سفرنامہ 'کالا پانی' لکھا۔ مولانا حبِ وطن تھے وہ اپنے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کروانا چاہتے تھے۔ اپنے ملک کی آزادی اور اپنی قوم کی اصلاح کے لیے مولانا نے ساری عمر جہاد کیا۔ انگریزوں نے مولانا کے اپنے قوم کے تئیں ہمدردی کے خطرے کو محسوس کیا اور انھیں سیاسی قیدی کی حیثیت سے موت کی سزا سنا ئی۔ بعد میں یہ سزا کالا پانی کی سزا میں تبدیل ہوگئی۔ مولانا کو مختلف جیلوں میں رکھا گیا اور بعد میں انہیں جزیرہ انڈومان لے جایا گیا۔ انڈومان میں وہ 11 جنوری 1866ء سے 11 ڈسمبر 1883ء تک رہے اور سترہ سال بعد اپنے وطن پانی پت واپس لوٹے۔ مولانا جعفر تھانیسری نے اپنے سفرنامہ 'تواریخِ عجیب' یعنی 'کالا پانی' میں اپنے سفر کی روداد بیان کی ہے۔ یہ ایک سیاسی قیدی کا سفرنامہ ہے۔ اس سفرنامہ میں ان کی زبان

سادہ اور سلیس ہے۔اسلوب صاف ستھرا اور نکھرا ہے۔

سرسید احمد خاں کا سفرنامہ 'مسافرانِ لندن' ہے جسے انہوں نے 1869ء لکھا۔سرسید احمد خاں کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے وہ ہمارے قومی رہنما تھے۔انھیں اپنی قوم اور ملک سے بڑی محبت تھی۔1857ء کی تباہی و بربادی کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ہماری قوم جو علم و فضل،صنعت و حرفت،تجارت اور حکمرانی میں سب سے اعلیٰ تھی۔آج اُس کی حالت دگرگوں ہو چکی ہے۔سرسید احمد خاں نے قوم کے مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔انہوں نے یہ بات اچھی طرح محسوس کر لی کہ قوم کی ترقی کا رازِ تعلیم میں پوشیدہ ہے۔لہٰذا لندن کے سفر کا بنیادی مقصد وہاں کے طریقۂ تعلیم،نصابِ تعلیم،اصول درس وتدریس اور وہاں کی تہذیب وثقافت سے واقفیت و معلومات حاصل کرنا تھا۔سرسید نے لندن کے مختلف کتب خانوں کا بھی معائنہ کیا۔سرسید لندن کی ترقی اور خوش حالی،نظم وضبط کو سراہتے ہیں اور اکثر اپنی قوم کا موازنہ انگریزوں کی ترقی سے کرتے نظر آتے ہیں۔سرسید نے اپنا سفرِ لندن کا آغاز یکم اپریل 1869ء سے کیا اور 4 ستمبر 1870ء میں ہندوستان واپس آئے۔اس سفر میں ان کے دونوں بیٹے سید حامد اور سید محمود ہم راہ تھے۔سرسید احمد خاں اپنے سفر کی روداد مع تنقید کے لندن سے بھیجتے اور یہ اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں شائع ہوتے۔ہندوستان واپس آنے کے بعد سرسید احمد خاں نے حالات سفر میں لکھے تمام مضامین اور خطوط کو مرتب کیا۔اس کا نام انہوں نے خود 'مسافرانِ لندن' تجویز کیا۔مگر یہ سرسید کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔بعد میں اسے محمد اسماعیل پانی پتی نے ترتیب دے کر مع مقدمہ مجلس ترقی ادب لاہور سے 1961ء میں شائع کیا۔

'سفرنامہ یورپ' مرزا نثار علی بیگ کا سفرنامہ ہے۔یورپ کا سفر انہوں نے 1885ء میں کیا تھا۔وہ تین مہینے لندن میں رہے۔مرزا نثار علی بیگ محکمۂ تعلیم سے وابستہ تھے۔اپنی ملازمت کے سلسلے میں انہوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کا سفر کیا تھا۔اپنے سابقہ تجربات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے انہوں نے اپنے سفرنامے میں لندن کے اسکول، کالجوں، یونیورسٹیوں کا بغور جائزہ لیا اور وہاں کے سرکاری ارکانِ کمیشن کے حالات و معاملات حکومت کے طریقۂ تعلیم پر خاطر خواہ بحث کی۔نثار علی بیگ نے اپنے سفرنامہ میں یوروپ کے رسم و رواج، عادات و اطوار، تہذیب و تمدن وہاں کی معاشرت، فکر و عمل، عمارتوں سڑکوں، گلیوں، پارکوں اور موسموں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

'سیر حامدی' یہ سفرنامہ ریاستِ رام پور کے نواب محمد حامد علی خاں کا لکھا سفرنامہ ہے۔نواب صاحب نے کم و بیش ساری دنیا کا سفر کیا ہے۔یہ سفر انہوں نے 3 مارچ 1883ء سے 9 جنوری 1884ء تک کیا۔دس ماہ کے اس سفر میں انہوں نے ہانگ کانگ، جاپان، ہوائی، فرانس، جرمنی، یونان، امریکہ، افریقہ، انگلستان اور مصر کی سیاحت کی۔یہ سفر انہوں نے سر آکلینڈ لیفٹیننٹ گورنر ممالکِ مغربی کی دعوت پر کیا تھا۔ہر ملک میں ان کا شایانِ شان استقبال ہوا۔ان

کی خوب تواضع کی گئ۔نواب صاحب نے مختلف مما لک کی تہذیبوں کا بغور معائنہ کیا اور اُن کی طرز معاشرت کا تجزیہ کیا۔خاص طور سے ترقی یافتہ مما لک میں سائنس کے حیرت انگیز انکشافات کو اُبھارنے کی کوشش کی۔

'سفر نامہ مصر روم وشام' علامہ شبلی نعمانی کا سفر نامہ ہے۔شبلی نعمانی ایک بے مثل ادیب، بلند پایہ شاعر،مورخ اور سوانح نگار تھے۔ انہوں نے بہت سی ادبی،تاریخی اور مذہبی کتابیں لکھی ہیں۔علامہ شبلی کو ادب،تاریخ اور تحقیق سے بڑا لگاؤ تھا۔اپنے علمی شوق کو پورا کرنے کی غرض سے انہوں نے روم،مصر اور شام کا سفر کیا۔ان کا یہ سفر خالص علمی سفر تھا۔شبلی 26 فروری 1892ء کو علی گڑھ سے روانہ ہوئے اور نومبر میں واپس آئے۔اس سفر سے واپسی کے بعد احباب کے اصرار پر انہوں نے یہ سفر نام لکھا۔اس سفر میں شبلی کے ہمراہ مشہور فلاسفر پروفیسر آرنلڈ تھے۔مسٹر آرنلڈ سے شبلی نے فرانسیسی سیکھی تھی۔مسٹر آنلڈ کا ساتھ سویز تک رہا پھر علامہ اُردن، بیروت، بیت المقدس ،قاہرہ اور قسطنطنیہ کا سفر کرتے ہوئے ہر قابل ذکر مدرسہ، دارالاقامہ، کتب خانے،سر رشتۂ تعلیم وتدریس کا بغور جائزہ لیتے رہے۔بادشاہوں اور صاحب اقتدار حضرات سے بھی ملے۔عربوں اور ترکوں کے اخلاق و عادات و آداب کے بارے میں تفصیلات حاصل کیں۔ساتھ ہی ساتھ شہر کے عام حالات،مشہور عمارات اور قابل دید مقامات کے بارے میں بھی لکھا۔ علامہ نے سفرِ جہاز کے واقعات بھی قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں اس سفر نامہ کی زبان نہایت دلچسپ اور سادہ ہے۔

'وسط ایشیا کی سیر' اور 'سیرِ ایران' شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے لکھے مشہور سفر نامے ہیں۔مولانا مزاجًا سفر پسند طبعیت کے مالک تھے۔انہیں سفر کے کئی مواقع بھی پیش آئے۔'وسط ایشیا کی سیر' مولانا آزاد کا سیاسی سفر ہے۔مولانا ایک سرکاری وفد کے رکن تھے جو وسط ایشیا کے حالات معلوم کرنے کی غرض سے حکومتِ ہند کی جانب سے نامزد کیے گئے تھے۔اس سفر نامہ کو آغا محمد اشرف نے مرتب کیا۔

مولانا کا دوسرا سفر نامہ 'سیرِ ایران' ہے۔ یہ مولانا کے روز ناموں کی مدد سے مرتب کیا گیا سفر نامہ ہے۔مولانا آزاد دورانِ سفر یاداشت کے طور پر لکھ لیا کرتے تھے۔بعد میں آغا محمد طاہر نے ان منتشر یاداشتوں کو مرتب کیا۔ایران کے سفر کا مقصد فارسی زبان میں لغت کی تیاری تھا۔اس کے علاوہ وہ ایران سے کتابیں بھی لانا چاہتے تھے۔مولانا کتابوں کے رسیا تھے۔دورانِ سفر نہ انہیں کھانے پینے کا ہوش رہتا تھا اور نہ آرام وآسائش کی فکر رہتی تھی۔سفر میں انہوں نے موسموں کا حال،سمندر،میدان، پہاڑ اور جنگل ہر مقام اور ہر جگہ کا جائزہ لیا۔دیہاتی اور شہری باشندوں کے مزاجوں پر روشنی ڈالی ہے۔محمد حسین آزاد کا اسلوب نگارش پڑھنے والوں کو سحر زدہ کیے بغیر نہیں رہتا۔

'سفر نامۂ بلادِ اسلامیہ' مولوی عبدالرحمٰن امرتسری کا مصر،شام،روم اور ترکی کا سفر نامہ ہے۔مولوی عبدالرحمٰن امرتسری اسلامی مما لک کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے اور وہاں کے مسلمانوں کی طرزِ زندگی سے واقفیت حاصل

کرنا چاہتے تھے۔اسی مقصد سے انہوں نے 1898ء میں یہ سفر کیا۔مولانا نے اپنے سفر نامہ میں ان اسلامی ممالک کی تہذیب ومعاشرت،رسم ورواج،مناظر قدرت وغیرہ کی اچھی تصویر کشی کی ہے۔

'سفر نامۂ یوروپ'اور'سفر نامۂ بغداد'منشی محبوب عالم کے سفر نامے ہیں۔منشی محبوب عالم 'پیسہ اخبار'کے ایڈیٹر تھے۔سفر نامۂ یوروپ'میں انہوں نے فرانس،انگلستان،روم،شام اورمصر کی سیاحت کی روداد بیان کی ہے۔ان ممالک کا سفر انہوں نے 1900ء میں کیا تھا۔منشی محبوب عالم نے دورانِ سفر تمام ممالک کو ایک سیاح،سیاست داں اور ایک صحافی کی آنکھ سے دیکھا ہے۔وہ سیاحت کو کامیابی کا ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ان کا خیال تھا کہ یوروپ کی سیاحت ہندوستانی عوام کے لیے اپنی سماجی اور معاشی زندگی کو بہتر بنانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

'سفر نامۂ یوروپ'میں منشی محبوب عالم ایک فطری سیاح نظر آتے ہیں۔ان کا سفر نامہ معلومات کا ایک نگار خانہ ہے جس میں یوروپ کی تہذیب ومعاشرت،رسم ورواج،آداب واخلاق،صنعت وحرفت،تعلیم وتربیت،اقتدار وروایات کے علاوہ وہاں کی گلیوں،سڑکوں،بازاروں،ہوٹلوں اور موسموں کا حال غرض ہر چیز کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔

'سفر نامۂ بغداد'منشی محبوب عالم کا دوسرا سفر نامہ ہے۔یوروپ کے سفر نامہ کے بعد انہوں نے عراق وعرب کی سیر کی۔منشی صاحب انڈین پریس ڈیپوٹیشن کے رکن تھے۔حکومتِ ہند نے اپنے نمائندے کی حیثیت سے اُنہیں بھیجا تھا۔اس سفر کا مقصد سیاسی تھا۔منشی محبوب عالم ایک سچے اور پکے صحافی تھے۔اس سفر نامہ میں ان کے شوقِ سیاحت نے انہیں ہر چیز کو دیکھنے اور ذوقِ صحافت نے انہیں ہر چیز لکھنے پر مجبور کر دیا۔'سفر نامہ بغداد'میں انہوں نے عرب وعراق کی تہذیب،تمدن کے علاوہ تاریخ وجغرافیہ کو بھی اہمیت دی ہے۔سفر نامہ کا اسلوب سادہ،زبان سلیس اور لب ولہجے میں بے تکلفی پائی جاتی ہے۔

ان سفر ناموں کے علاوہ انیسوی صدی میں اور بھی سفر نامے لکھے ملتے ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

1) میگس تھنیز کی کتاب کا نام بتایئے؟

2) اردو کا پہلا سفر نامہ کس نے اور کب لکھا؟

3) ''سیرِ حامدی''کس کا سفر نامہ ہے؟

2.4 بیسویں صدی میں اردو سفرنامہ

بیسویں صدی میں نثری اصناف جیسے مکتوب نگاری مضمون، انشائیہ، خاکہ اور سوانح کے ساتھ ساتھ سفرناموں کی بھی ترقی ہوئی۔ سفرنامہ نگاری میں مرد حضرات کے ساتھ خواتین بھی نظر آتی ہیں جنہوں نے بہترین سفرنامے لکھے۔ بیسویں صدی میں لکھے گئے چند اہم سفرناموں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسین کا سفرنامہ '1907ء کا جاپان' ہے۔ یہ سفرنامہ خطوط کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے جو انہوں نے دورانِ سفر لدھیانہ میں مقیم اپنے دوست عبداللہ جان لدھیانوی کو لکھتے رہے۔ ڈاکٹر محمد حسین ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان تھے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔

وظیفہ حسن سے سبکدوشی کے بعد انگلستان اور پھر عرب میں رہائش اختیار کی۔ سیاحت کے شوق نے کئی ممالک کی سیر کروائی۔ اس سفرنامہ میں انہوں نے جاپان کے جغرافیائی اور تاریخی عوامل کا نہایت صحیح اور واضح نقشہ کھینچا۔ خصوصاً جاپانیوں کے اخلاق و عادات اور تہذیب و معاشرت کی سچی عکاسی کی۔ ڈاکٹر محمد حسین کی تحریر سادہ اور رواں ہے۔ قاری ان کی تحریروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس سفرنامہ میں سفرنامہ نگار ایک دوست ایک رفیق اور رہبر کی صورت میں سامنے آتا ہے اور جاپان کے تمام رازوں کو آشکار کرا دیتا ہے۔

عطیہ بیگم فیض الرحمن جو عطیہ فیضی کے نام سے شہرت رکھتی ہیں نے سفرنامہ 'زمانۂ تحصیل' 1908ء میں لکھا۔ عطیہ فیضی حصولِ تعلیم کی غرض سے وظیفہ پر لندن گئیں تھیں۔ قیامِ لندن کے دوران جو خطوط انہوں نے اپنی بہن زہرا بیگم کو لکھے تھے بعد میں انہیں ترتیب دے کر سفرنامہ کی شکل دیا اور یہ سفرنامہ قسط وار رسالہ 'تہذیب النسوان' میں شائع ہوتا رہا۔ عطیہ فیضی نہایت ذہین اور ہر دل عزیز خاتون تھیں۔ ان کی ذہانت سے علامہ شبلی نعمانی اور علامہ اقبال جیسی عظیم شخصیتیں متاثر تھیں۔ سفرنامے میں انہوں نے مشہور شخصیتوں، دعوتوں، مجلسوں اور محفلوں کا ذکر کیا ہے۔

نازلی رفعیہ سلطان کا سفرنامہ 'سیر یوروپ' ہے جو 1908ء میں شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ خطوط پر مشتمل ہے۔ جو انہوں نے ہندوستان میں مقیم اپنے بزرگوں کو یوروپ سے لکھے تھے۔ سفرنامے کی پہچان نسوانی اندازِ تحریر ہے۔ 'سیر یوروپ' میں ایک مشرقی عورت کی نظر سے انہوں نے یوروپی تہذیب کا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ یوروپ کی تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت سے بے حد متاثر ہیں اور ہندوستان کی بدحالی، پسماندگی، جہالت، افلاس، بے اصولی اور نظم و ضبط سے عاری زندگی گزارنے کے طریقوں سے افسردہ ہیں۔ اپنے سفرنامہ کے ذریعے اہل وطن کو نئی دنیا کی تمدنی اور صنعتی ترقی کی سیر کرانے کی کوشش کرتی ہیں۔ رفیعہ بیگم نازی یوروپ کی خواتین کی آرائش، وزیبائش سے متعلق اشیاء کا ذکر تفصیل اور ذوق و شوق کے ساتھ کرتی ہیں۔

munotes.in

بیگم سر بلند جنگ بہادر نے سفر نامہ 'دنیا عورت کی نظر میں' 1910ء میں لکھا۔ سفر نامہ 'سیاحت سلطانی' شاہ بانو کا لکھا سفر نامہ ہے۔ شاہ بانو 1911ء میں والیِ بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم کے ہمراہ بغرض علاج لندن گئیں تھیں۔ شاہ بانو نوابی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں ان کے یہاں ایک وضع داری، پاسداری، تہذیبی رکھ رکھاؤ اور مذہبِ اسلام سے گہری وابستگی ملتی ہے جس کی وجہ سے وہ لندن کی اسلام بیزار سوسائٹی میں گھل مل نہ سکیں۔ لندن کو دیکھتی ہے تو حیران ہو جاتی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا کو دیکھ کر انہیں بھوپال یاد آتا ہے۔ اپنے سفر نامے میں لکھتی ہیں کہ جنیوا میں گھڑیوں کا بہت بڑا کارخانہ ہے اور یہاں گھڑیاں تمام ہندوستان میں بہت مشہور ہیں۔

شیخ عبدالقادر نے 'مقام خلافت' اور 'سیاحت نامۂ یوروپ' کے نام سے دو سفر نامے لکھے۔ شیخ عبدالقادر اردو زبان کے مشہور و معروف رسالہ ''مخزن'' کے مدیرِ اعلیٰ اور صاحبِ طرز انشا پرداز تھے۔ اردو میں جدید علوم اور رومانیت کو متعارف کرانے کا سہرا انہیں کے سر ہے۔ 'سفر نامہ مقامِ خلافت' میں انہوں نے ترکستان کے سفر کی روداد بیان کی ہے۔ شیخ عبدالقادر نے ترکستان میں تقریباً پونے دو ماہ قیام کیا۔ استنبول کی سیاسی، سماجی زندگی اور تعلیمی و تہذیبی سرگرمیوں کو انہوں نے نہایت خوبصورت الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ترکی میں انہوں نے علمی سرگرمیوں کی جانب زیادہ توجہ دی۔ تعلیمی درس گاہیں دیکھیں، عالموں اور فاضلوں سے ملاقاتیں کیں، قدیم کتب خانوں کی سیر کی۔ 'سیاحت نامۂ یوروپ' منشی صاحب کا دوسرا سفر نامہ ہے۔ اس سفر نامہ میں انہوں نے یوروپی ممالک کی سیاحت کو بیان کیا ہے۔ منشی صاحب سیر و تفریح کے دلدادہ تھے۔ دلفریب مناظر اور ہر اچھی چیز کو نگاہِ شوق سے دیکھتے تھے۔ یوروپ کے قدرتی مناظر جیسے برف سے ڈھکی چوٹیوں، شفاف چشموں، کوہستانی علاقوں کا ذکر وہ شوق سے کرتے نظر آتے ہیں۔

'روزنامچہ سیاحت' خواجہ غلام الثقلین کا سفر نامہ ہے۔ خواجہ غلام الثقلین نے روس، قسطنطنیہ، عراق، ایران اور عرب ممالک کا سفر کیا۔ اپنے سفر نامہ میں انہوں نے ان ممالک کو جغرافیائی تناظر اور تاریخ کے معاشرتی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے دلچسپ واقعات سے اپنے سفر کی کشش میں اضافہ کرتے ہیں۔

اردو کے بے مثل ادیب، بے باک صحافی اور صاحب طرز انشا پرداز خواجہ حسن نظامی جنہیں 'مصورِ فطرت' کہا جاتا ہے نے کئی سفر نامے لکھے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کا پہلا سفر نامہ 'سفر نامۂ ہندوستان' ہے۔ اس سفر نامہ میں انہوں نے ہندوستان کی اہم شخصیات سے ہوئی ملاقاتیں اور مختلف اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضریوں کی تفصیل بیان کی ہے۔

دوسرا اہم سفر نامہ 'مصر و فلسطین شام و حجاز' ہے اس سفر نامہ میں مصر، فلسطین، شام و حجاز کے اہم مقامات اور اہم شخصیات کی تصاویر شامل کی گئیں ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنے سفر نامے میں ان ممالک کی طرز معاشرت، سیاسی و سماجی حالات، رسم و رواج، اخلاق و عادات اور تعلیم تربیت پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور جا بجا موازنہ اور تجزیہ بھی کیا ہے۔

'سفرنامہ افغانستان' میں خواجہ حسن نظامی افغانیوں کے عادات واطوار، اخلاق ومعاملات اور عقائد وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ 'سیر دہلی' کے نام سے خواجہ حسن نظامی نے ایک مختصر رسالہ لکھا۔خواجہ حسن نظامی کا ایک اور سفرنامہ 'سفرنامۂ پاکستان' ہے اس سفرنامے میں انہوں نے کراچی، لاہور اور پاکستان کے مختلف شہروں کا ذکر کیا ہے۔

'سفرنامہ شیخ الہند' شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن ایک عالم، بلند پایہ محدث، متقی و پرہیزگار انسان تھے۔ساری دنیا کے مسلمانوں کے دکھ ودرد کو وہ اپنا دکھ درد سمجھتے تھے۔ملت کے تئیں مولانا کے اس درد اور تڑپ کو انگریزی حکومت نے منفی انداز میں لیا اور انہیں گرفتار کرنے کا بہانہ ڈھونڈنے لگی۔ایسے ناسازگار حالات میں مولانا نے خود کو ملک سے باہر رہنا بہتر سمجھا اور اپنے چند رفقاء کے ساتھ دیوبند کو خیرآباد کرتے ہوئے حجاز کے سفر پر نکل پڑے۔حجاز میں چند ہی برس سکون سے گذرے تھے کہ وہاں کے سیاسی حالات بھی ناسازگار ہوگئے۔ انگریزی حکومت نے مولانا کو گرفتار کرلیا۔ پہلے مصر اور بعد میں مالٹا میں قیدی بنائے رکھا۔مولانا کے ہمراہ مولانا حسین احمد مدنی، وحید احمد، مولوی حکیم نصرت حسین اور مولوی عزیز گل تھے۔انگریزوں نے ان پر کئی مقدمے چلائے۔سزائے موت کا بھی اندیشہ رہا لیکن شکوک وشبہات جاتے رہے تو انگریزی حکومت نے انہیں رہا کر دیا۔

'سفرنامہ شیخ الہند' مولانا محمود حسن صاحب کا تحریر کردہ سفرنامہ نہیں ہے بلکہ ان کے ہمراہی مولانا حسین احمد مدنی کا تحریر کردہ سفرنامہ ہے۔ جو قید وبند میں مولانا کے ساتھ تھے۔ ہر واقعہ کے چشم دید گواہ تھے۔انہوں نے تمام حالات وواقعات کو ترتیب دیا۔انہوں نے اس سفرنامے میں سیاسی اور تاریخی واقعات کی روداد کے ساتھ مصر کی تہذیب وتمدن کو بھی بیان کیا ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھی کا سفرنامہ 'کابل میں سات سال' ہے۔سندھ ان کا وطن تھا اس لیے سندھی کے نام سے مشہور ہوئے۔مولانا عبیداللہ سندھی شیخ الہند مولانا محمود حسن کے شاگرد تھے اور مولانا محمود حسن سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔شیخ الہند بھی مولانا سندھی سے بڑی محبت کرتے تھے۔شیخ الہند علم باعمل ہونے کے ساتھ ساتھ ملک وقوم کے سیاسی معاملات میں بھی حصہ لیتے تھے اور اتحادِ عالمِ اسلامی کے لیے ہمیشہ فکرمند رہتے تھے۔پہلی جنگِ عظیم اپنے شباب پر تھی۔اس موقع پر مولانا عبیداللہ سندھی کو شیخ الہند نے سیاسی مشن کے زیر اثر کابل جانے کا حکم دیا اور وہ وہاں سات سال تک مقام پذیر رہے۔اپنے قیامِ کابل میں انھوں نے جو کچھ دیکھا اسے سفرنامہ کی شکل میں پیش کر دیا اور مولانا نے افغانستان کی سیاست کا نہایت قریب سے جائزہ لیا اور گہرائی سے مطالعہ کیا۔انہوں نے افغانستان میں انقلابی تحریک کے لیے بہت کام کیے۔حصول آزادی کی کوششوں کے دوران 'ریشمی رومال خطوط' کی انقلابی تحریک کے وہ روح رواں تھے۔اپنے سیاسی اغراض ومقاصد کی تکمیل میں اس درجہ مصروف تھے کہ انھیں افغانستان کو غیر سیاسی زاویہ نگاہ سے دیکھنے

کی مہلت ہی نہیں ملی۔اس کے باوجود ان کے یہاں کہیں کہیں معاشی معاشرتی اور تجارتی معلومات اور زبان و بیان کے تعلق سے بھی کچھ کام کی باتیں مل جاتی ہیں۔

'اعمال نامہ' سر رضا علی کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔لیکن یہ خودنوشت دورانِ سفر لکھی گئی ہے۔اس لیے اسے سفرنامہ کے زمرہ میں شامل کیا گیا ہے۔سر رضا علی کا شمار ہندوستان کی اہم سیاسی شخصیات میں ہوتا ہے۔برطانوی حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔کئی بار سرکاری حیثیت سے انگلستان کا سفر کیا۔ان کا دل مشرقی اور ذہن مغربی تھا۔سر رضا علی نے افریقہ کے دو سفر کیے۔جنوبی افریقہ کا پہلا سفر انہوں نے 1935ء حکومت ہند کی جانب سے افریقہ میں مقیم ہندوستانی باشندں کے مسائل کی تحقیقات کے سلسلے میں کیا۔اور دوسری مرتبہ انہیں جنوبی افریقہ کا انگریزی حکومت کا ریذیڈنٹ جنرل مقرر کا گیا تھا۔1938ء تک وہ افریقہ میں مقیم رہے۔سر رضا علی کی آپ بیتی 'اعمال نامہ' میں جنوبی افریقہ میں گزارے ہوئے انہیں ایام کا تفصیلی احوال ہے۔یہ آپ بیتی نہیں ہے بلکہ اس میں ایسے بہت سے تجربات اور مشاہدات انہوں نے بیان کیے ہیں کہ جن کی وجہ سے اسے سفرناموں کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔سر رضا علی نہایت بے باک اور جری انسان تھے۔'اعمال نامہ' کی زبان برجستہ اور نثر خوبصورت ہے۔اپنے سفرنامے کو انہوں نے مختلف اشعار کے برمحل استعمال سے رنگین بنایا ہے۔

'سفرنامۂ حجاز' اور 'سفرنامہ عراق' مولانا حسرت موہانی کی بیگم نشاط النساء کے لکھے سفرنامے ہیں۔مولانا حسرت موہانی اردو کے منفرد شاعر، ممتاز ناقد اور جنگ آزادی کے مجاہد اول تھے۔ان کی بیگم ایک باہمت، فعال، جری اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں وہ سفر و حضر میں ہمیشہ مولانا کے ساتھ رہیں۔1936ء میں نشاط النساء بیگم نے مولانا حسرت موہانی کے ساتھ حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور عراق کا بھی سفر کیا۔انہوں نے سفرِ حج بیت اللہ اور سفر عراق کے مشاہدات و واقعات کو سفرناموں کی صورت میں مرتب کیا۔'سفرنامہ عراق' میں انہوں نے عراق کی تہذیب و معاشرت خصوصاً خواتین کے شوق، رہن سہن، طور طریقہ، آرائش و زیبائش اور تعلیم و تربیت پر روشنی ڈالی ہے۔

مہاراجہ سر کشن پرشاد کے دو سفرنامے 'سیر پنجاب' اور 'سفرنامہ' ہیں۔مہاراجہ سر کشن پرشاد حیدرآباد دکن کے وزیر اعظم تھے۔سر کشن پرشاد ایک دانشور انسان تھے۔ان کی شخصیت بہت پر کشش، مطالعہ گہرا اور ذہن وسیع تھا۔وہ انسانوں کی اچھی پرکھ رکھتے تھے۔'سفرنامہ' میں انہوں نے دکن کی سیاست اور معاشرت کی بہترین عکاسی کی ہے۔ریاستِ حیدرآباد سے متعلق یہ ایک معتبر ماخذ ہے۔

'سیاحتِ ماجدی' مولانا عبدالماجد دریابادی کا سفرنامہ ہے۔اس کے علاوہ 'سفرِ حجاز'، 'ڈھائی ہفتہ پاکستان میں' اور 'تاثراتِ دکن' ان کے سفرنامے ہیں۔مولانا ایک باعلم اور عظیم انسان تھے۔انہوں نے

بہار، مدراس، لاہور، کلکتہ، دہلی، حیدرآباد، بھوپال جیسے شہروں کا سفر کیا اور خلوص کے ساتھ اپنے سفر کی روداد پیش کی۔ ان کا یہ سفرنامہ 'سیاحتِ ماجدی' گیارہ سفروں کا مجموعہ ہے۔

'سیر افغانستان' سید سلیمان ندوی کا سفرنامہ ہے۔ یہ سفر انہوں نے افغانستان کے فرمانروا نادرشاہ کی دعوت پر کیا تھا۔ نادرشاہ افغانستان میں تعلیمی اصلاحات چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے صلاح ومشورہ کی غرض سے سید سلیمان ندوی کو افغانستان آنے کی دعوت دی۔ جسے انہوں نے قبول کرلی۔ اس سفر میں ان کے ہمراہ ڈاکٹر سر محمد اقبال اور سرسید احمد خاں کے پوتے سرراس مسعود بھی تھے۔ اپنے تیز مشاہدے کے ذریعہ 'سیر افغانستان' میں سید سلیمان ندوی نے افغانستان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی، تمدنی، تاریخی، جغرافیائی، مذہبی، مجلسی، معاشی، علمی، تعلیمی اور معاشرتی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔

بیگم ہمایوں مرزا (صغریٰ ہمایوں مرزا) نے کئی سفر کئے۔ ان کے سفرنامے 'سفرنامہ یوروپ' 'سیر بہار و بنگال' 'سیاحت جنوبی ہند' 'سفرنامہ بھوپال وآگرہ ودہلی' اور سفرنامہ' عراق' ہیں۔ صغریٰ ہمایوں مرزا حیدرآباد سے شائع ہونے والے رسالہ 'النساء' کی مدیرہ تھیں۔ وہ تعلیمِ نسواں کی حامی خاتون تھیں۔ 'سفرنامہ بھوپال وآگرہ ودہلی' میں انہوں نے بھوپال، آگرہ اور دہلی کی تہذیب وتمدن کو بیان کیا ہے۔ 'سفرنامہ یوروپ' میں انہوں نے ہالینڈ، جرمنی، اٹلی، فرانس اور انگلستان کا سفر کرتے ہوئے ان ممالک کی تہذیب وتمدن پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔

ناول 'لیلیٰ کے خطوط' اور 'مجنوں کی ڈائری' کے مصنف قاضی عبدالغفار کا سفرنامہ 'نقشِ فرنگ' ہے جس میں انہوں نے سفرِ انگلستان کی روداد بیان کی ہے۔ ہندوستانی سیاست دانوں کا اور دانشوروں کا ایک وفد برطانیہ کے وزیرِ اعظم لارڈ جارج سے ملاقات کرنے کی غرض سے روانہ ہوا تھا۔ قاضی عبدالغفار اس وفد کے ایک معزز رکن تھے۔ شہرِ لندن کی وہ نہ تو تعریف کرتے ہیں اور نہ بے گانگی کا اظہار کرتے ہیں۔ لندن کے حسین نظاروں میں ان کے لیے کوئی خاص کشش اور دلچسپی نہیں تھی۔ اپنے سفرنامے میں انہوں نے انگریزوں کی سیاست اُن کی نفسیات اور اُن کی شاطرانہ مزاج کو بے باکانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ قاضی عبدالغفار کا سفرنامہ اس اعتبار سے ایک نئی جہت کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس میں گردوپیش کے مناظر ومظاہر اور تاریخ کے اوراق کی سیر کے بجائے سفرنامہ نگار نے اپنے جذبات و تاثرات اور تجربات ومشاہدات کی سیر کرائی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کا یہ سفرنامہ اپنے اندازِ فکر اور طرزِ تحریر کی وجہ سے سفرنامہ نگاری کے جدید رجحان کی نشاندہی کرتا ہے۔

قدرت اللہ شہاب نے دو سفرنامے 'اے بنی اسرائیل' اور 'توابھی رہگذر میں ہے' لکھے۔ قدرت اللہ شہاب اپنے سفرناموں کے ذریعے کسی ملک کی تاریخ وجغرافیہ، تہذیب اور مملکتوں کی سیاسی ہنگامہ آرائیوں کے بجائے وہاں کے انسانوں کے باطن کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں۔ اُن کا دماغ سے رابطہ قائم کرتے ہیں اور کسی ایک بات ایک نظر، ایک

واقعہ یا ایک خیال سے دور تک اور دیر تک سفر کرتے ہیں۔

دوہے کے مشہور شاعر ممتاز و معروف کالم نویس جمیل الدین عالی کے دو سفر نامے 'دنیا میرے آگے' اور 'تماشا میرے آگے' ہیں۔ جمیل الدین عالی سیاحت کے شوقین ہیں۔ انھوں نے دنیا کے بیشتر ممالک کا سفر کیا۔ سفر نامہ 'دنیا میرے آگے' میں انہوں نے فرانس، برطانیہ، روس، مصر، لبنان، ایران اور دہلی کے سفر کی کیفیات بیان کی ہیں۔ دوسرا سفر نامہ 'تماشا میرے آگے' میں انہوں نے اٹلی، سوئزرلینڈ اور ہالینڈ کے سفر کا احوال بیان کیا ہے۔ عالی اپنے سفر ناموں میں یوروپ اور ایشیا کے مختلف ممالک کی سیر کراتے ہیں کہ قاری گھر بیٹھے ان ممالک سے واقف ہو جاتے ہے۔ عالی کے سفر نامے روایت اور جدت کا حسین امتزاج ہیں۔ وہ ایک زندہ دل انسان تھے۔ انہوں نے جو دیکھا اور جیسا محسوس کیا اُسے ڈرامائی انداز میں بیان کر دیا۔ ان کے اسلوب میں اردو اور فارسی کے اشعار اور مصرعوں کا برجستہ استعمال ملتا ہے۔ اُن کی تحریر میں جادوئی اثر ہے۔ جو قاری کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔

'مسافر کی ڈائری' خواجہ احمد عباس کا سفر نامہ ہے۔ خواجہ احمد عباس اشتراکیت پسند ادیب اور صحافی تھے۔ 1938ء میں انہوں نے 'ورلڈ یوتھ کانگریس' جو نیو یارک میں منعقد ہوا تھا شرکت کی اور تقریباً سترہ ممالک کا انہوں نے سفر کیا۔ جن میں کولمبو، ہانگ کانگ، جاپان، کینیڈا، انگلستان، ترکی، عراق اور ایران وغیرہ ممالک شامل ہیں۔ ان ممالک کے سفر کے دوران انہوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اُسے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ خواجہ احمد عباس اشتراکیت کے مبلغ اور وکیل تھے۔ انہوں نے ہر مقام اور ہر جگہ کو اپنے اسی نظریے کی روشنی میں پرکھا جانچا۔ معاشرے میں جہاں کہیں تضاد دیکھتے تو ان کے لب و لہجے میں تلخی آ جاتی اور طنز اُبھر آتا اور اس کے خلاف پرزور احتجاج کرتے۔ اشتراکیت سے انہیں اتنا لگاؤ تھا کہ ہر چیز میں وہ اشتراکیت تلاش کرتے۔ یہاں تک کہ کوئی چیز اشتراکیت سے مختلف نظر آتی وہ اسے نظر انداز کر جاتے ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کے سفر نامے 'ترکی میں دو ہفتے'، 'کابل سے یرموک تک' اور 'شرق اوسط میں کیا دیکھا' ہیں۔ سید ابوالحسن علی ندوی عرف علی میاں ہندوستان کے مستند تاریخ داں، معتبر عالمِ دین اور عربی، فارسی اور اردو کے ادیب و نقاد ہیں۔ تاریخ اسلام سے انھیں خصوصی دلچسپی ہے۔ اسلامی تاریخ کے ایک عالم اور ایک سنجیدہ اسکالر کی حیثیت سے انھیں کئی بار اسلامی ممالک جانے کے مواقع حاصل ہوئے۔ مولانا نے جب بھی سفر کیا اپنے تاثرات اور تجربات و مشاہدات کو قلمبند کیا۔ سفر نامہ 'ترکی میں دو ہفتے' میں مولانا نے ترکی سے پہلے دمشق کا سفر کیا۔ دمشق یونیورسٹی نے مولانا کو تعلیمی خطبات کے لیے مدعو کیا تھا۔ مولانا نے جامعہ الازہر کی سیر کی وہاں کے کتب خانوں اور قرب وجوار کے علاقوں کا بھی سفر کیا۔ اس کے بعد وہ ترکی پہنچے۔ ترکی میں انہوں نے قونیہ، انگورہ اور قسطنطنیہ کی سیر کی اور ان شہروں کی

اخلاقی اور تہذیبی حیثیت پر روشنی ڈالی ہے۔مولانا علی میاں ندوی اپنے دوسرے سفر نامہ' کابل سے یرموک تک' میں مغربی ایشیا کے چھ ممالک افغانستان، ایران، لبنان، شام، عراق اور اردن کے سفر کی روداد بیان کی ہے۔ان کا یہ سفر تقریباً ڈھائی ماہ 4 جون 1973ء سے 20 اگسٹ 1973ء تک رہا۔ یہ سفر نامہ انہوں نے عربی میں لکھا تھا۔ بعد میں اس کی افادیت کے پیش نظر اردو میں ترجمہ کیا گیا۔مولانا کے اس سفر کا مقصد ممالکِ اسلامیہ کے حالات و کوائف، علمی اداروں سے متعلق معلومات حاصل کرنا اور عالم اسلام کا ایک دوسرے سے رابطہ قائم کرانا تھا۔'شرق اوسط میں کیا دیکھا' اس سفر نامہ میں مولانا نے مصر کی معاشرت کے ساتھ ساتھ وہاں کی سیاسی، سماجی، علمی، تاریخی اور جغرافیائی حالات کا ذکر کیا ہے۔

صالحہ عابد حسین نے 'سفر زندگی کے لیے سوز و ساز' کے نام سے سفر نامہ لکھا۔ اپنے سفر نامہ میں وہ لکھتی ہیں کہ' کلام پاک میں سفر و سیاحت کی تاکید بار بار آئی ہے۔اسلام نے سیاحت کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے'۔اندرونِ ملک ہندوستان انہوں نے کشمیر، دہلی، بھوپال، حیدرآباد، پٹنہ، راجستھان، بمبئی، مدراس، بنگلور اور میسور کی سیاحت کی تو بیرونِ ملک انہوں نے عدن، سوئزرلینڈ، یوروپ، فرانس، پاکستان، ایران، سعودی عرب اور عراق وغیرہ کے سفر کیے۔'سفر زندگی کے لیے سوز و ساز' صالحہ عابد حسین کا ایک کامیاب سفر نامہ ہے۔اس سفر نامہ سے اُن کی شخصیت، مزاج اور معتقدات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔'

سفر نامہ راہ نوردِ شوق' ڈاکٹر عابد حسین کا سفر نامہ ہے۔ڈاکٹر عابد حسین ایک دانشور، مفکر، مترجم، نقاد اور ایک بہترین ادیب تھے۔ 1967ء میں انہوں نے عراق و شام کا سفر کیا تھا۔اس سفر کے دوران انہوں نے اپنی بیگم صالحہ عابد حسین کو خط لکھے تھے۔صالحہ عابد حسین نے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد ان خطوط کو سفر نامہ کی صورت میں شائع کیا۔اس سفر نامہ میں ڈاکٹر عابد حسین نے عراق اور شام کی سیاسی و سماجی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ان کا مطالعہ وسیع نظر گہری اور ذہن کشادہ ہے۔اسلوب میں شگفتگی اور سلاست کے ساتھ لطیف مزاح کا عنصر بھی شامل ہے۔

خواجہ غلام السّیدین کے سفر نامے' دنیا میرا گاؤں'،' نگہ بلند، سخن دلنواز' اور' جاں پرسوز' ہے۔خواجہ غلام السّیدین مہذب، شائستہ اور وسیع ذہن و قلب کے انسان تھے۔ان کا تعلق علمی گھرانے سے تھا۔خواجہ غلام السّیدین اپنے خاندان کی علمی روش پر گامزن رہے انہوں نے ہندوستان کے تعلیمی میدان میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔اپنی زندگی میں انہوں نے کئی سفر کیے۔ممالک اسلامیہ، یوروپ، امریکہ، چین، سوئیڈن اور ناروے وغیرہ ممالک کا سفر انہوں نے کیا۔مقاصد کے اعتبار سے ہر سفر تعلیمی سرگرمیوں اور فرائض منصبی سے وابستہ تھا۔ان کا مطالعہ وسیع اور تجربہ وقیع ہے۔وہ مشرقی اقتدار کے دلدادہ تھے۔ان کے سفر ناموں میں لطافت، تنوع اور شائستگی پائی جاتی ہے۔

قرۃ العین حیدر کا شمار بنیادی طور پر ایک ناول اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ہوتا ہے۔اردو فکشن میں انہوں نے کئی ادبی انعامات اور ایوارڈ حاصل کیے۔ادب کے سب سے بڑے اور باوقار ایوارڈ 'گیان پیٹھ' سے انہیں نوازا گیا ہے۔قرۃ العین حیدر نے 'جہانِ دیگر' اور 'دکھلائیے لے جاکے اسے مصر کا بازار' کے نام سے دو سفر نامے لکھے۔قرۃ العین حیدر کا اسلوب نگارش اردو ادب میں اپنی ایک شناخت رکھتا ہے۔ان کے افسانوں اور ناولوں میں قدیم ہندوستانی تہذیب کے ساتھ ساتھ نوابین کی تہذیب و تمدن کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔اسی ملی جلی تہذیب کی جھلکیاں ان کے سفر ناموں میں نظر آتی ہیں۔

'زمین اور فلک اور' انتظار حسین کا سفر نامہ ہے۔انتظار حسین اردو کے اہم فکشن نگار ہیں۔ہندوستان ان کا وطن ہے اور کئی بار وہ اپنے وطن کا سفر کر چکے ہیں۔جب بھی اپنے وطن آتے ہیں اپنے بچپن کے ہندوستان کو تلاش کرتے ہیں۔یہاں کی بعض تبدیلیاں انھیں خوشگوار معلوم ہوتی ہیں تو بعض تبدیلیوں سے شکایت ہونے لگتی ہے۔اُن کے نزدیک ماضی کے ہندوستان کی جو رونقیں تھیں اب وہ ختم ہوچکی ہیں۔تقسیم سے پہلے والا ہندوستان اب کہیں موجود نہیں ہے۔یہاں تک کہ ناگپور کے سنترے، لکھنؤ کی ریوڑیاں، بنارس کے رس گلے بھی بے مزہ ہو گئے ہیں۔ماضی اور حال کے تصادم کے باوجود انتظار حسین کی عبارت میں جا بجا لطافت اور شگفتگی کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔

سید احتشام حسین کا سفر نامہ 'ساحل اور سمندر' ہے جو ڈائری ہے۔جس میں انہوں نے امریکہ اور انگلستان کے تعلق سے اپنے تاثرات اور خیالات کا اظہار کیا ہے یہ سفر لکھنؤ یونیورسٹی کی جانب سے انہوں نے کیا تھا۔مختلف شہروں جیسے پیرس، نیویارک، گل پیٹرک، آلیورلایل، فلاڈلفیا، واشنگٹن، شکاگو، کیلی فورنیا اور لاس اینجلس جیسے شہروں کی سیر کی۔وہاں کے یونیورسٹیوں، کتب خانوں، سائنس میوزیمس، بازاروں، لوہے کے کارخانوں، سمنٹ کی فیکٹریوں کے علاوہ آرٹ انسٹی ٹیوٹ کا انہوں نے معائنہ کیا۔احتشام حسین کا سفر نامہ 'ساحل اور سمندر' امریکہ اور انگلستان کی طرزِ زندگی کا بہترین عکاس ہے۔

'چلتے ہو تو چین چلو' ابنِ انشا کا سفر نامہ ہے۔'آوارہ گرد کی ڈائری'، 'دنیا گول ہے' اور ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں' ان کے دیگر سفر نامے ہیں۔'چلتے ہو تو چین چلو' میں ابنِ انشا نے پاکستانی ادیبوں کے وفد کے ساتھ چین کی سیاحت کی۔سفرِ چین کے دوران انہوں نے وہاں کے عجائب گھر، ہوٹلوں، ٹرینوں، یونیورسٹیوں اور لائبریریوں کا دورہ کیا۔چین کے مختلف شہروں اور وہاں کے اخبارات کا جائزہ لیا۔ابنِ انشا کا یہ سفر نامہ چین کی بہترین عکاسی کرتا ہے ہے۔انہوں نے وہاں کے ہر پہلو پر نگاہ ڈالی ہے۔دلچسپیوں سے پُرمزاحیہ اور طنزیہ انداز بیاں لیے ہوئے یہ سفر نامہ پڑھنے والوں کے لیے ایک تفریح کا سامان ہے۔'دنیا میرے آگے' یہ سفر نامہ بھی دلچسپ ہے۔اس سفر نامہ میں ابنِ انشا ایران، عراق، لبنان

اورمصر کےمختلف علاقوں کی سیر کرتے نظر آتے ہیں۔ان کا یہ سفر نامہ طنز ومزاح سے پُر ہے۔اسے پڑھنے کے بعد ایک فرحت اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔'آوارہ گرد کی ڈائری' ابنِ انشا کا مزاحیہ سفر نامہ ہے۔اس سفر نامے میں انہوں نے یوروپ کے سفر کی روداد بیان کی ہے۔اس سفر نامہ میں ابنِ انشالندن، جرمنی، پیرس کی سیر کرتے وہاں کے کتب خانوں،نقشوں اورتصویروں کابغورجائزہ لیتے نظر آتے ہیں۔'ابنِ بطوطہ کے تعاقب میں' یہ ابنِ انشا کا آخری سفر نامہ ہے اس سفر نامے کا انداز طنز ومزاح سے بھر پور ہے۔ ابنِ انشا اپنی تحریروں میں جگہ جگہ محاورے اور چٹکلے استعمال کرتے ہیں۔ان کے سفر ناموں کو پڑھ کر طبیعت سیر ہو جاتی ہے۔

اردو ادب کے مستند عالم،ادیب،صاحب طرز انشا پرداز،جدید ادب کے ناقدوزیر آغا کا سفر نامہ'ایک طویل ملاقات' ہے۔وزیر آغا 1963ء میں ہندوستان آئے تھے۔اس سفر میں ان کے ہمراہ ان کے اہل خانہ بھی تھے۔وزیر آغا نے ماضی کی حسین یادیں اس سفر نامے میں سمیٹے ہیں۔وہ ایک سادہ دل اور شائستہ انسان ہیں اور ان کی تحریر شفاف ذہین کی آئینہ دار ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا سفر نامہ'دیدو باز دید' ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پور کے رہنے والے تھے۔تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے۔ پاکستان تو وہ چلے گئےلیکن ان کا دل ہمیشہ اپنے وطن کی یاد میں تڑپتا رہتا۔جب بھی ہندوستان آتے اپنے پرانے دوستوں،عزیزوں اور بزرگوں سےٹوٹ کر ملتے۔ان کے سفر نامے میں ہندوستان سے خلوص واپنائیت کا احساس ملتا ہے۔

'ارضِ پاک سے دیارِفرنگ تک' اور'ترکی میں دو سال' ڈاکٹر عبادت بریلوی کے سفر نامے ہیں۔ڈاکٹر عبادت بریلوی اردو کے مشہور نقاد ہیں۔درس تدریس کے سلسلے میں انہیں لندن میں پانچ برس کے قیام کا موقع ملا۔اس طویل عرصے میں انہوں نے لندن اور اُس کی معاشرت کو قریب سے دیکھا۔لندن میں انہیں نہایت مخلص اساتذہ اور دوستوں کا ایک وسیع حلقہ مل گیا۔جن کی وجہ سے انہوں نے اپنا وقت خوشی خوشی گزارا۔انہیں اپنے وطن کی یاد بھی ستاتی رہی لیکن لندن نے انہیں مایوس نہیں کیا۔البتہ لندن کے اخلاقی اقدار اور بے جا آزادی سے اُنہیں بڑا دکھ پہنچا۔اُنہیں لندن کی بے راہ روی پسند نہ آئی۔اس سفر نامہ میں انہوں نے لندن کے تعلیمی،تربیتی،تہذیبی اور معاشرتی زندگی پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ان کا طرزِ اسلوب سادہ،شگفتہ اورزبان سلیس ہے۔'ترکی میں دو سال' ڈاکٹر عبادت بریلوی کا دوسرا سفر نامہ ہے۔اس سفر کا مقصد درس و تدریس ہی تھا۔وہ یہاں دو سال رہے۔لندن کی بہ نسبت ترک قوم کی تہذیب وتمدن اور ثقافت سے بہت خوش اور مطمئن نظر آتے ہیں۔ترکی کے باشندوں شہروں اور قصبوں سے بے حد متاثر ہیں اور کھل کر ان کی تعریف کرتے ہیں۔

پطرس بخاری کا سفرنامہ 'سفرانگلستان' ہے یہ سفرنامہ خطوط پر منحصر ہے۔جو انہوں نے اپنے دوست امتیاز کو انگلستان سے لکھے تھے۔ پطر بخاری ایک فطرت پسند انسان تھے۔اس لیے ان کے سفرنامہ میں فطرت پسندی نظر آتی ہے۔سفرنامہ میں حیرت اور جستجو نمایاں ہے۔انہوں نے بیسویں صدی کے انگلستان کی ادبی،ثقافتی اور تہذیبی زندگی کی بہترین مرقع کشی کی ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا سفرنامہ 'جنوبی ہند میں دو ہفتے' ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد اردو کے مشہور شاعر اور ماہرِ اقبالیات ہیں۔ انہوں نے اندرون وبیرون ملک بے شمار سفر کیے۔سفرنامہ 'جنوبی ہند میں دو ہفتے' میں انہوں نے مدراس کے ایک مشاعرے کی روداد بیان کی ہے۔ساتھ ہی مدراس کی مختلف ادبی تقریبات اور مختلف شخصیتوں کا ذکر کیا ہے۔

'شوقِ آوارگی' یہ عطاء الحق قاسمی کا سفرنامہ ہے۔عطاء الحق قاسمی ایک زندہ دل لطیفہ سنج ،خوش مزاج و جملے باز انسان ہیں۔جب انہوں نے امریکہ کا سفر کیا تو ان کی یہ ساری خصوصیات ان کے ساتھ رہیں۔اپنے سفرنامے میں انہوں نے بعض مقامات پر امریکی معاشرے کو طنز وتضحیک کا نشانہ بنایا ہے۔

رام لعل اردو کے مشہور افسانہ نگار ہیں۔ان کا سفرنامہ 'پاکستان' زرد پتوں کی بہار' ہے۔رام لعل اپنے آبائی وطن کی یاد میں پاکستان پہنچتے ہیں۔ یہ سفر انہوں نے 1980ء میں کیا تھا۔رام لعل اپنے وطن پہنچ کر بار بار ماضی کی طرف لوٹنے لگتے ہیں۔آج کے دور میں اخلاقیات،قدیم اقدار وروایات کی پاسداری ماضی کی باتیں لگتی ہیں لیکن وہ اپنے وطن کی مٹی میں قدم رکھ کر مطمئن اور خوش ہیں کہ آج بھی ان کا وطن چاہتوں سے آباد ہے۔

'سفرنامۂ پاکستان' اور 'جزیروں کی سرگوشیاں' بلراج کومل کے سفرنامے ہیں۔بلراج کومل ایک حساس شاعر ہیں۔انہیں جہاں محبت اور خلوص نظر آتا ہے وہ اس دلدادہ ہوجاتے ہیں اور اس منظر کو دل کی گہرائیوں میں اُتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ 1981ء میں انہوں نے لاہور پاکستان کا سفر کر کیا۔لاہور ان کا وطن تھا۔اور تقسیم کے بعد وہ دہلی چلے آئے ۔لاہور میں ان کے بچپن کے دوست اور پرانے رفیق اُن سے ملنے کے لیے بے چین تھے۔اپنے دوستوں سے مل کر اُن کے درمیان رہ کر انھیں کسی بھی طرح کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ان کا یہ سفرنامہ دراصل ایک محبت نامہ ہے جو اپنے پاکستانی دوستوں کے تئیں جذباتی عقیدت اور محبت کے زیر اثر لکھا گیا ہے۔

جوگندر پال اردو کے ایک مشہور ومعروف افسانہ نگار ہیں۔انہوں نے 1982ء میں پاکستان کا سفر کیا۔اس سفر کی روداد انہوں نے 'پاکستان کی یاترا' میں بیان کی۔ جوگندر پال ایک تخلیق کار ہیں۔انھوں نے ہر شئے کو ایک ادیب اور ایک افسانہ نگار کی آنکھ سے دیکھا ہے۔دونوں ملکوں کی تہذیبوں میں اُنہیں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ایک تہذیب، ایک

muntes.in

زبان و بیان،لب و لہجہ۔اسی وجہ سے اُنہیں کراچی کے مشاعرے پر گورکھپور کے مشاعرے کا گمان گذرتا ہے۔جوگیندر پال کے اسلوب کامخصوص انداز ہے وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بات کرتے ہیں۔ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں غزل کا لطف آتا ہے۔معاشرتی زندگی پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی ہے۔ان کا طرزِ اسلوب سادہ،شگفتہ اورزبان سلیس ہے۔

مجتبیٰ حسین اردو نثر نگاروں میں ایک مقبول ومعتبر نام ہے۔وہ کالم نگار،انشائیہ نگار،خاکہ نویس اورطنزومزاح نگار ہیں ۔ انہوں نے پیرس،لندن،کناڈا،امریکہ،جاپان،سابق سویت یونین اورسعودی عرب کے سفرکیے۔'جاپان چلوجاپان چلو'اور'سفرلخت لخت' میں انہوں نے اپنے سفرکی روداد بیان کی ہے۔مجتبیٰ حسین کے ان سفرناموں کوحسن چشتی سے مرتب کرکے'مجتبیٰ حسین کے سفرنامے' کےعنوان سے شائع کیاہے۔

مستنصرحسین تارڑاردوسفرنامے کاایک اہم نام ہے۔انہوں نے' نکلے تیری تلاش میں'،'اندلس میں اجنبی'،'خانہ بدوش'اور ہنزہ داستان' کے نام سے سفرنامے لکھے۔مستنصرحسین کےسفرنامےشوق سے پڑھے جاتے ہیں۔باریک بینی اورجزیات نگاری میں انہیں کمال حاصل ہے۔اردوسفرناموں کوانہوں نے نئی جہت سے آشنا کیااوراسے نئی سمت ورفتار بخشی۔ان کےسفرنامے تخلیقی فن کاری کی بہترین مثال ہیں۔

محمدعمرخاں ریاست محمد گڑھ باسودہ کےنواب تھے۔سیروسیاحت کابڑا شوق تھا۔سفرکےساتھ ساتھ روداد سفر بیان کرنے کابھی بڑا شوق تھا۔'زادِسفر'،'زادِغریب'،'آئینۂ فرنگ'،'سفرنامۂ رئیس'،'نیرنگ رنگون'،'نیرنگِ چین'،'فرہنگِ فرنگ'،'قندِمغربی' انکےسفرنامے ہیں۔

اردو،عربی،فارسی اورانگریزی کے عالم محقق وادیب پروفیسرمحسن عثمانی ندوی کاسفرنامہ'دنیاکوخوب دیکھا' ہے۔اس سفرنامہ میں انہوں نے امریکہ،لندن،ترکی،شام اردن اورایران کےسیاحت کی روداد بیان کی ہے۔

منظورالامین ریڈیونشریات کی دنیامیں ایک اہم اورمعتبر نام ہے۔ان کا سفرنامہ'بدلتے رنگ' ہے۔انھوں نے اپنے اس سفرنامے میں شہرلندن کی تہذیب کاذکرکیاہے۔ساتھ ہی وہ وہاں کے ماربل آرج،ہائیڈ پارک اورآکسفورڈ کی تعریف کرتے ہیں۔لندن کے MW میڈیم ویو براڈکاسٹنگ،ہائی فریکونسی HF،فکشن،آرٹ گیلری،مومی مجسموں اور ساسرسٹ ہاؤس کاذکرکرتے ہیں۔منظورالامین نے اپنے سفرنامہ میں لندن کی مکمل عکاسی کےساتھ ساتھ بڑے ناصحانہ انداز میں انمول باتیں بھی بتائی ہیں۔سفرنامہ کااسلوب سب سے جدااورحقیقت کا جامہ پہنے ہوئے ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

1) خواجہ غلام السعیدین کے سفرناموں کے نام بتائیے؟

2) 'مسافر کی ڈائری' کس کا سفرنامہ ہے؟

3) عطیہ فیضی نے اپنے سفرنامے میں کس ملک کی روداد بیان کی ہے؟

2.5 اردو سفرنامہ نگاری اور عصرِ حاضر

ف۔س۔اعجاز اردو کے مشہور ادیب اور قلم کار ہیں۔انہوں نے اپنے سفر یوروپ کی روداد 'یوروپ کا سفر نامہ' میں بیان کی ہے یہ سفر ف۔س۔اعجاز کا ادبی سفر تھا۔اوسلو ناروے میں منعقدہ مشاعرے کے تذکرے کے ساتھ ساتھ ماسکو کی سیر وسیاحت، عجائب گھر، روسیا ہوٹل اسکوائر کی مختصر تاریخ اور لومونوسوت یونیورسٹی سے متعلق اپنے مشاہدات کو انہوں نے بیان کیا ہے۔

'ازبیکستان۔انقلاب سے انقلاب تک' اردو کے مشہور ادیب اور نقاد پروفیسر قمر رئیس کا سفرنامہ ہے۔اس سفرنامے میں انہوں نے تاشقند، سمرقند اور بخارا وغیرہ کے مدارس، مساجد، مقابر، میوزیم، بازار، چڑیا گھر، علماء کے مزارات، زیارت وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

'لندن یاترا' ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا سفرنامہ ہے جو لندن کے سفر سے متعلق حالات اور تاثرات کا مجموعہ ہے۔

'سفر آشنا' ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا سفرنامہ ہے۔اس سفرنامہ میں انہوں نے جرمنی، ناروے، کینیڈا، انگلستان کے سفر کی روداد بیان کی ہے۔گوپی چند نارنگ نے یہ سفر ادبی انجمنوں کی دعوت پر کیا تھا۔اس لیے اس سفرنامے میں ادبی شخصیات، تقریبات اور کتابوں کا ذکر ملتا ہے۔

ظہیر انور کے سفرنامے 'چراغ راہ گذر' میں سفرِ انگلستان کی روداد ملتی ہے۔

'جرمنی میں دس روز' علی احمد فاطمی کا تحریر کردہ سفرنامہ ہے۔اس سفرنامہ میں انہوں نے جرمنی میں مقیم علمی و ادبی شخصیات و دیگر ادبی احوال پر روشنی ڈالی ہے۔ان کا اسلوب رواں ہے۔اس لیے یہ سفرنامہ دلکش اور دلچسپ ہے۔

ڈاکٹر صغریٰ مہدی کا سفرنامہ 'سیر کر دنیا کی غافل' ہے۔صغریٰ مہدی ناول و افسانہ نگار ہیں۔فکشن نگاری کے علاوہ انہوں نے سفرنامہ نگاری بھی کی ہے۔صغریٰ مہدی کا خاندان بھوپال سے تعلق رکھتا تھا اور صغریٰ مہدی کی تعلیم و تربیت اپنے ماموں ڈاکٹر عابد حسین اور ممانی صالحہ عابد حسین کے گھر دہلی میں ہوئی تھی۔

صغریٰ مہدی جب بھوپال جاتی ہیں اور اپنے بچپن کی باتیں اپنے نذیر بھیا سے سنتی ہیں تو اُن کی ذہنی اور جذباتی

وابستگی اور اپنائیت جاگتی ہے اور جب انگلستان کا سفر کرتی ہیں تو حیرت سے وہاں کے سفر کی روداد بیان کرتی ہیں۔صغریٰ مہدی کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ گھومنے پھرنے اور ہر چیز کو بغور دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔اپنے سفر ناموں میں وہ اپنی شخصیت کو ضرورت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتیں۔معصومیت، شگفتگی، شائستگی اور بے ساختہ پن ان کے سفر ناموں کی جان ہے۔

'دیکھا ہم نے استنبول' ڈاکٹر صبیحہ انور کا سفر نامہ ہے۔اس سفر نامے میں انہوں نے شہر استنبول کی آیا صوفیہ مسجد، نیلی مسجد، گرینڈ بازار، کپالی کارسی، توپ کاپی، رقص درویش، مسجدِ سلیمانیہ اور پرنس آئی لینڈ وغیرہ کی سیاحت کی روداد بیان کی ہے۔

'استنبول سے استنبول تک' ادریس صدیقی کا سفر نامہ ہے۔اس سفر نامے میں انہوں نے شہرِ استنبول کی تہذیب وثقافت وہاں کے مشہور مقامات پر اپنی رائے مخصوص ادبی اسلوب میں بیان کیا ہے۔اس سفر نامہ میں ادریس صدیقی نے جگہ جگہ اردو کے مشہور شعرا کے مختلف اشعار اور مصرعوں کو بلا تکلف موقع ومحل کے استعمال کیا ہے۔

'خوابوں کا جزیرہ موریشس' دردانہ قاسمی کا سفر نامہ ہے۔دردانہ قاسمی علی گڑھ میں درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔اپنے سفر نامہ میں انہوں نے موریشس کے خوبصورت مقامات، موریشس کی تاریخ، جغرافیہ، تہذیب وتمدن، زبان اور بولیوں وغیر پر معلومات فراہم کی ہیں۔

ان سفر ناموں کے علاوہ عصر حاضر میں اور بھی سفر نامے لکھے ملتے ہیں۔جن میں رئیس فاطمہ کا سفر نامہ 'میرے خوابوں کی سرزمین' 'بازیدِ حرم' سہیل انجم، رضیہ بٹ کا سفر نامہ 'امریکی یاترا'، شہناز نبی کا سفر نامہ 'کشمیر جنت نظیر' لالی چودھری کے سفر نامے 'دلی ایک شہرِ آرزو'، خیابان خیابان ارم' الحمراء' کاخ وکدائے' 'سفر نامہ اندیل' 'جینوا شہر امن یا شہر جیب تراشاں' ترنم ریاض کے سفر نامے 'میم چائے' اور 'دوشیزائے غیاز' قمر جمالی کے سفر نامے شاخِ بنات، 'آخری تکون'، 'اتکل کلینگا اور اڑیسہ ڈاکٹر ارشد جمیل کا سفر نامہ 'غبارِ سفر' وغیرہ اہم ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

1) 'خوابوں کا جزیرہ موریشس' کس کا سفر نامہ ہے؟

2) لالی چودھری کے سفر ناموں کے نام بتایئے؟

3) عصرِ حاضر کے چند سفر نامہ نگاروں کے نام بتایئے؟

2.6 خلاصہ

یہ انسان کی سرشت میں ہے کہ وہ یکسانیت سے جلد اکتا جاتا ہے۔ اسے نئی نئی چیزیں دیکھنے اور جاننے کی خواہش ہوتی ہے۔ اور یہی خواہش اسے سفر کی طرف مائل کرتی ہے۔ سفر کے ذریعہ اس کے مشاہدات اور تجربات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس لیے سفر کو کامیابی کی کنجی کہا گیا ہے۔

ہیروڈوٹس کو پہلا سفر نامہ نگار اور میگس تھینیز کو ہندوستان کا پہلا سیّاح کہا جاتا ہے۔ جو چندر گپت موریہ کے عہد میں ہندوستان آیا تھا۔ اس کے بعد چین، عرب اور ایران سے کئی سیّاح ہندوستان آئے۔ ان سیّاحوں نے ہندوستان کے مختلف علاقاؤں کے ساتھ یہاں کی تہذیب تمدن اور معاشرت کا ذکر اپنے سفر ناموں میں کیا ہے۔

اردو کا پہلا سفر نامہ نگار یوسف خان کمبل پوش ہے۔ جس نے 'عجائباتِ فرنگ' کے نام سے 1838ء میں اپنا سفر نامہ لکھا۔ اس سفر نامہ میں یوسف خان کمبل پوش نے اپنے سفرِ انگلستان کی روداد بیان کی ہے۔

انیسویں صدی عیسوی میں اردو میں کئی سفر نامے لکھے ملتے ہیں جن میں سرسید احمد خاں کا سفر نامہ 'مسافرانِ لندن'، مولانا جعفر تھانیسری کا سفر نامہ 'کالا پانی'، علامہ شبلی نعمانی کا لکھا 'سفر نامۂ مصر روم وشام' اور مولانا محمد حسین آزاد کے سفر نامے 'وسط ایشیا کی سیر' اور 'سیرِ ایران' اہم ہیں۔

بیسویں صدی میں لکھے گئے سفر ناموں میں منشی محبوب عالم کا 'سفر نامۂ بغداد'، خواجہ غلام الثقلین کا سفر نامہ 'روز نامچہ' خواجہ حسن نظامی کے سفر نامے 'سفر نامۂ ہندوستان'، 'مصر و فلسطین وشام وحجاز'، 'سفر نامۂ افغانستان'، 'سفر نامۂ پاکستان' ہیں۔ خواجہ احمد عباس اور دوسرے سفر نامہ نگاروں نے بھی سفر نامے لکھے ہیں۔ آزادی کے بعد لکھے گئے سفر ناموں میں عطاالحق قاسمی کا سفر نامہ 'شوقِ آوارگی'، بلراج کومل کے سفر نامے 'سفر نامۂ پاکستان' اور 'جزیروں کی سرگوشیاں'، جوگیندر پال کا سفر نامہ 'پاکستان یاترا'، وزیر آغا کا سفر نامہ 'ایک طویل ملاقات'، ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا سفر نامہ 'دیدوباز دید' کے علاوہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، مستنصر حسین تارڑ، ابنِ انشا، مجتبیٰ حسین وغیرہ کے سفر نامے ملتے ہیں۔

بیسویں صدی میں خواتین سفر نامہ نگاروں کے سفر نامے ملتے ہیں۔ جن میں عطیہ فیضی، رفیعہ سلطان نازلی، بیگم ہمایوں مرزا، نشاط النساء بیگم، صالحہ عابد حسین، قرۃ العین حیدر اہم ہیں۔

عصرِ حاضر کے سفر ناموں میں گوپی چند نارنگ کا سفر نامہ 'سفر آشنا'، صغریٰ مہدی کا سفر نامہ 'سیر کر دنیا کی غافل'، علی احمد فاطمی کا 'جرمنی میں دودن'، دردانہ قاسمی کا 'خوابوں کا جزیرہ موریشس'، ڈاکٹر ارشد جمیل کا سفر نامہ 'غبارِ سفر'، ترنم ریاض کے سفر نامے 'میم چائے' اور دوشیزائے غیار وغیرہ اہم سفر نامے ہیں۔

2.7 نمونۂ امتحانی سوالات

ا) مختصر جوابات

(1) مولانا محمد حسین آزاد کے سفرناموں پر اظہار خیال کیجیے۔

(2) سر سید احمد خاں کے سفرنامے 'مسافران لندن' پر روشنی ڈالیے۔

(3) خواجہ حسن نظامی کے سفرناموں کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

(ب) تفصیلی جوابات

(1) علامہ شبلی نعمانی کے سفرنامے 'سفرنامہ مصر روم وشام' پر اپنے خیالات کا اظہار کیجیے۔

(2) ابنِ انشا کے سفرناموں کا جائزہ لیجیے۔

(3) اردو سفرنامہ نگاری میں خواتین کی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

munotes.in

2.8 فرہنگ

روداد	کیفیت، حالت، رپورٹ
ہمراہ	ساتھ چلنے والا، ساتھی، ساتھ، سنگ
عقیدت	اعتقاد، دل کا بھروسہ، ایمان
قیام	کھڑا ہونا، موجودگی، سلامتی
وفد	نمائندوں کی جماعت، چند اشخاص کا کوئی پیغام لے کر کسی حاکم کے پاس جانا
قاری	پڑھنے والا، جمع قارئین
لطافت	عمدگی، خوبی، نرمی
شگفتگی	خوشی، مسرت، فرحت، شادابی
مبلغ	پہنچانے والا، تبلیغ کرنے والا، مشنری
احتجاج	اعتراض، حجت، انکار، مخالفانہ آواز
مدعو	دعوت دیا گیا، بلایا گیا

قرب وجوار	آس پاس، پاس پڑوس، اردگرد
عکاسی	تصویر کشی
تنوع	قسم قسم کا ہونا، مختلف رنگ کا ہونا
شائستگی	تہذیب، سلیقہ، تمیز، اخلاق
فرحت	خوشی، شادمانی، سرور
چٹکلے	چٹکلا کی جمع، مذاق، لطیفہ، فقرہ یا چھوٹی سی بات
تضحیک	ہنسی اڑانا، ذلت، رسوائی
حساس	زیادہ محسوس کرنے والا، ہوشیار
لب ولہجہ	تلفظ، طرزِ کلام، طرزِ گفتگو
مستند عالم	سند پایا ہوا عالم
معاشرت	مل جل کر زندگی بسر کرنا

2.9 معاون کتابیں

ا۔ ڈاکٹر بشریٰ رحمٰن — اردو کے غیر مذہبی سفرنامے گورکھپور، 1999

۲۔ خالد محمود — اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، 1995

۳۔ قدسیہ قریشی — اردو سفرنامہ، انیسویں صدی میں، لکھنؤ 1987

۴۔ انور سدید — اردو ادب میں سفرنامہ، نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن، 2020

☆☆☆

اکائی : ۳ ۔ مجتبیٰ حسین

ساخت :

3.1 اغراض ومقاصد
3.2 تمہید
3.3 مجتبیٰ حسین کا عہد
3.4 مجتبیٰ حسین کی حیات وشخصیت
3.5 مجتبیٰ حسین کی ادبی خدمات
3.6 ’جاپان چلو جاپان چلو‘ مجتبیٰ حسین کی سفرنامہ نگاری کا جائزہ
3.7 بلیٹ ٹرین میں کبھی نہ بیٹھو (عبارت کی تشریح)
3.8 خلاصہ
3.9 نمونۂ امتحانی سوالات
3.10 فرہنگ
3.11 معاون کتابیں

3.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد طلبا کو مجتبیٰ حسین کے عہد، ان کی حیات وشخصیت اور ان کے فن سفرنامہ نگاری کی امتیازی خصوصیات سے واقف کرانا ہے۔اور ساتھ ہی مجتبیٰ حسین کے سفرنامے ’جاپان چلو جاپان چلو‘ سے متن ’بلٹ ٹرین میں کبھی نہ بیٹھو‘ کے مطالعہ کے ذریعے طلبا میں ادبی ذوق پیدا کرنا ہے۔اور اس سفرنامے کے متن کی تشریح وتفہیم طلباء میں موضوعاتی وفنی تجزیہ کا تنقیدی شعور پیدا کرے گی۔اس اکائی کے مطالعہ کے بعد طلبا اس قابل ہوجائیں گے کہ

- مجتبیٰ حسین کے عہد کے بارے میں بتاسکیں گے۔
- مجتبیٰ حسین کے حالاتِ زندگی سے متعلق معلومات حاصل ہوکریں گے،جن کی مدد سے آپ ان کی شخصیت اورفن کو بہتر طور سمجھ سکیں گے۔
- مجتبیٰ حسین کی ادبی خدمات پر گفتگو کرسکیں گے۔

۔ مجتبیٰ حسین کی سفرنامہ نگاری، جاپان چلو جاپان چلو کے خصوصی حوالے سے اظہار خیال کرسکیں گے۔
۔ مجتبیٰ حسین کے سفرناموں میں طنزیہ ومزاحیہ اسلوب پر روشنی ڈال سکیں گے۔

3.2 تمہید

اردو میں سفرنامہ نگاری کی روایت بہت قدیم ہے۔ سفرنامہ میں مصنف جس ملک کا سفر کرتا ہے اس ملک کی تاریخ وتہذیب، سیاست و معاشرت کو جزئیات نگاری کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ سفرنامہ نگار اپنے تجربات و مشاہدات ادبی انداز میں بیان کرتا ہے۔ جس کے سبب سفرنامہ کا مطالعہ کرنے والا قاری اس ملک اور قوم سے متعلق واقفیت حاصل کرتا ہے۔ پرانے زمانے آمدورفت کے ذرائع بہت محدود ہوا کرتے تھے اس لیے لوگ بہت مشکل سے سفر کرتے تھے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر تو بہت دشوار ہوتا تھا اس لیے لوگ کم سفر کرتے تھے جس کے سبب دوسرے ممالک سے واقفیت بھی کم ہی ہوتی تھی۔ جب سفرنامے لکھے جانے لگے تو لوگ ان کے مطالعے سے معلومات حاصل کرنے لگے۔ سفر کی صعوبتیں اٹھائے بغیر سفر کے مزے سے لطف اندوز ہونے لگے۔ اس طرح اس صنف کو شہرت حاصل ہوتی گئی۔

3.3 مجتبیٰ حسین کا عہد

مجتبیٰ حسین نے جدوجہد آزادی کا زمانہ دیکھا ملک جب آزاد ہوا تو وہ گیارہ برس کے تھے۔ گاندھی جی قیادت میں مجاہدین آزادی ہندوستان کی مکمل آزادی کی مانگ کررہے تھے۔ بھگت سنگھ، سکھ دیو، راج گرو، رام پرساد بسمل، اشفاق اللہ جیسے محب وطنوں کی قربانیوں اور پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، سردار پٹیل، بال گنگا دھر تلک اور دیگر سیاسی رہنماؤں اور ان گنت لوگوں کی انتھک کوششوں کے بعد ملک آزاد ہوا۔ لیکن آزادی کے ساتھ ہی ملک کی تقسیم اور فرقہ وارانہ فسادات نے آزادی کے سورج کو گرہن لگا دیا۔ کئی لوگ اپنی زمین سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ مجتبیٰ حسین کے بھائی ابراہیم جلیس بھی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے تھے۔ اپنوں سے جدائی اور ہجرت کا کرب اس دور کے ادب کا ایک اہم موضوع رہا۔

آزادی کے بعد ہندوستان نے جمہوری طرزِ حکومت کو اپنایا' ملک کا دستور بنا، ریاستوں کی تشکیل عمل میں آئی۔ تعلیم کو عام کرنے، روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے صنعتوں کا قیام ہونے لگا، سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی پر زور دیا جانے لگا اس طرح ملک ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا۔ ادب میں یہ دور ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ ہے۔ مجتبیٰ حسین بھی ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ مخدوم محی الدین ان کے پسندیدہ شاعر تھے۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں

کے مطالعے سے ان کا نہ صرف ادبی شعور بلکہ سماجی و سیاسی شعور بھی پختہ ہوتا چلا گیا۔مجتبیٰ حسین نے اپنی تحریروں کے ذریعے انسان دوستی اور آپسی رواداری کا پیغام دیا۔ ملک انگریزوں کی غلامی سے تو آزاد ہو گیا تھا لیکن سماج میں اب بھی نابرابری تھی، معاشی عدم توازن تھا، غربت، بے روزگاری، رشوت خوری اور مختلف سماجی برائیاں ملک کی ترقی کی راہ میں حائل تھیں۔مجتبیٰ حسین ایک حساس اور باشعور قلم کار ہیں انھوں نے ملک کے ان مسائل، سیاسی بے اعتدالیوں، سماجی ناہمواریوں کو موضوع بنا کر اپنے مخصوص طنزیہ و مزاحیہ اسلوب میں پیش کیا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ آزادی کے بعد ہندوستان نے کس طرزِ حکومت کو اپنایا؟

۲۔ مجتبیٰ حسین کے بھائی کا نام کیا ہے جو تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے؟

۳۔ مجتبیٰ حسین کس ادبی تحریک سے متاثر تھے؟

3.4 مجتبیٰ حسین کی حیات و شخصیت

آزادی کے بعد اردو طنز و مزاح کی روایت پر نظر ڈالیں تو ہمیں کئی بڑے نام ملتے ہیں ان میں ایک اہم نام مجتبیٰ حسین کا ہے۔انھیں بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔ان کی ولادت 15/ جولائی 1936ء کو چنچولی تحصیل، ضلع گلبرگہ، کرناٹک میں ہوئی۔ ان کے والد مولوی احمد حسین اور والدہ امیر النساء بیگم تھیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم گلبرگہ کے مدرسۂ تحتانیہ آصف گنج میں ہوئی، یہیں سے مڈل تک کی تعلیم حاصل کی۔گھر میں علمی ماحول تھا ان کے والد کو مطالعہ کا شوق تھا گھر میں بہت سی علمی و ادبی کتابیں موجود تھیں جن سے مجتبیٰ حسین نے بھی استفادہ کیا ان میں بھی مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا۔مجتبیٰ حسین نے 1951 میں میٹرک اور 1953 میں انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔گلبرگہ میں انٹرمیڈیٹ کالج میں دورانِ طالب علمی وہ بزمِ اردو کے جنرل سکریٹری تھے۔ یہاں سے ان کی تخلیقی و تنظیمی صلاحیتوں کو جلا ملی۔اسی سال انھوں نے گلبرگہ میں ایک تاریخی مشاعرہ منعقد کرایا جس میں کیفؔی اعظمی، مجروحؔ سلطان پوری، جگن ناتھ آزادؔ، سلیمان اریبؔ اور شاہدؔ صدیقی جیسے نامور شعراء نے شرکت کی۔

مجتبیٰ حسین نے 1953ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے آرٹس کالج، حیدرآباد میں گریجویشن کے لیے داخلہ لیا۔ یہاں بھی بزم ادب کے سکریٹری منتخب ہوئے اور کالج کی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں میں نئی روح پھونک دی۔ 1956ء میں گریجویشن کی تکمیل کے بعد 1958ء میں Diploma in Public Administration میں امتیازی کامیابی

حاصل کی۔ 11/نومبر 1956ء کو ان کی شادی ناصرہ بیگم سے ہوئی۔ ان کی چار اولادیں ہوئیں، دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ تعلیم مکمل ہونے کے بعد حیدرآباد کے محکمہ مال حکومت آندھرا پردیش میں نہایت قلیل مدت کی ملازمت کے بعد مجتبیٰ حسین روزنامہ سیاست سے وابستہ ہو گئے۔ ان کے بڑے بھائی محبوب حسین جگر روزنامہ سیاست کے جوائنٹ ایڈیٹر تھے۔ تقریباً سات برسوں تک ایک صحافی کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 31/جولائی 1962ء کو روزنامہ سیاست کے مشہور کالم نگار شاہد صدیقی کا انتقال ہو گیا جو شیشہ و تیشہ کے عنوان سے کالم لکھا کرتے تھے۔ محبوب حسین جگر نے یہ کالم لکھنے کی ذمہ داری مجتبیٰ حسین کو دے دی۔ یہاں سے ان کی طنز و مزاح نگاری کا سفر شروع ہوا۔

مجتبیٰ حسین 1962ء سے 1972ء تک حکومت آندھر پردیش کے محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ سے بھی وابستہ رہے اور حکومتِ ہند نے جب اردو کے مسائل کا جائزہ لینے کی غرض سے گجرال کمیٹی تشکیل دی تو انھیں اس کے شعبۂ ریسرچ میں کام کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس طرح انھوں نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی۔ اس سلسلے میں گوپی چند نارنگ رقمطراز ہیں:

> ''ڈھائی سو سال پہلے ارضِ دکن سے غزل کا شہزادہ ولی دکنی دہلی آیا تھا اور اب
> ڈھائی سو سال بعد ارضِ دکن سے مزاح کا شہزادہ دہلی آیا ہے اور اس کے آتے ہی
> دہلی کی مزاحیہ محفلوں میں ایک جان سی پیدا ہو گئی ہے''۔

1972 سے 1974ء تک شعبۂ ریسرچ گجرال کمیٹی کا حصہ رہے۔ دہلی میں قیام کے دوران مجتبیٰ حسین 19/ستمبر 1974 میں این سی ای آر ٹی سے وابستہ ہو گئے اور کونسل کے پبلی کیشنز ڈویژن کے شعبہ کے ایڈیٹر کے فرائض انجام دینے لگے۔ انھوں نے اکتوبر 1980ء میں یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کی جانب سے طباعت و اشاعت کے موضوع پر منعقدہ ایک ورک شاپ میں ہندوستان کی نمائندگی کی خاطر جاپان کا دورہ کیا۔ تقریباً 35 دن وہاں رہے اور بہت سے لوگوں سے ملاقات کی، کئی مقامات کی سیر کی نہایت باریک بینی سے جاپانی قوم کی زندگی کا مشاہدہ کیا۔ جاپان کی ٹوکیو یونیورسٹی میں ان کے اعزاز میں ایک ادبی تقریب بھی منعقد کی گئی۔ انھوں نے اس سفر کی روداد جاپان چلو جاپان چلو کے نام سے قلمبند کی جس کا شمار اردو کے بہترین مزاحیہ سفرناموں میں ہوتا ہے۔ 1991 میں شعبہ پبلی کیشن این سی ای آر ٹی سے سبکدوش ہو کر حیدرآباد واپس آ گئے، یہاں ادبی انجمنوں کی سرپرستی کرتے رہے، ضعیفی و کمزوری کے باوجود سمیناروں اور ادبی محفلوں میں شرکت کر کے منتظمین اور نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کے ذریعے ادب کی خدمت انجام دیتے رہے۔ مختصر سی علالت کے بعد 27 مئی 2020ء کو مجتبیٰ حسین کا انتقال ہو گیا۔

اسفار: جاپان کے علاوہ مجتبیٰ حسین نے دنیا کے مختلف ممالک جیسے برطانیہ، فرانس، امریکہ، کینڈا، سعودی عرب، روس،

munotes.in

تاشقند، سمرقند، بخارا، پاکستان، مسقط، دوبئی وغیرہ کا سفر کیا اور ان اسفار کے تجربات و مشاہدات کو ''سفر لخت لخت'' کے عنوان سے پیش کیا۔ انعامات و اعزازات؛ مجتبیٰ حسین کو ان کی ادبی خدمات کے لیے ملک اور بیرون ملک کئی ایک انعامات و اعزازات سے نوازا گیا ہے۔

☆ 1980ء میں ہندوستانی ادب میں طنز و مزاح کے فروغ کے لیے اڑیا زبان کے ادیبوں کی تنظیم 'سرس ساہتیہ سمیتی' نے ہاسیہ رتن کا خطاب عطا کیا۔

☆ 6/جولائی 1982ء کو غالب انسٹی ٹیوٹ نے پہلے 'غالب ایوارڈ برائے طنز و مزاح' سے نوازا۔

☆ 9/نومبر 1983ء کو 'بزم ساز و ادب دہلی' نے انھیں ''نشانِ امتیاز'' سے نوازا۔

☆ 1989ء اردو اکادمی دہلی نے تخلیقی ادب کے لیے ایوارڈ عطا کیا۔

☆ 26/اکتوبر 1996ء کو The Usmanians, USA نے ان کی خدمات کے اعتراف میں اجلاس منعقد کیا۔

☆ 1996ء میں اردو اکادمی آندھرا پردیش نے انھیں پہلے کل ہند ''مخدوم لیٹریری ایوارڈ'' کے لیے منتخب کیا۔

☆ 1997-98ء میں ہریانہ اردو اکادمی نے انھیں ''مہیندر سنگھ بیدی ایوارڈ برائے طنز و مزاح'' سے سرفراز کیا۔

☆ جون 2001ء میں کرناٹک اردو اکیڈمی مجموعی خدمات کے اعتراف میں اعزاز سے نوازا۔

☆ حکومتِ ہند نے 2007ء میں پدم شری کے اعزاز سے سرفراز کیا۔

☆ بزمِ صدف دوہا، قطر نے 2017ء میں ایوارڈ سے نوازا۔

اپنے مطالعے کی جانچ

1۔ مجتبیٰ حسین کب اور کہاں پیدا ہوئے؟

2۔ مجتبیٰ حسین ابتداء میں کس اخبار میں مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے۔

3۔ مجتبیٰ حسین کو پدم شری ایوارڈ کب ملا تھا؟

munotes.in

3.5 مجتبیٰ حسین کی ادبی خدمات

مجتبیٰ حسین نے کئی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے انھوں نے طنزیہ ومزاحیہ اسلوب میں خاکے، انشائیے، سفرنامے، مضامین اور کالم لکھے ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے مزاحیہ خاکے لکھ کر اردو خاکہ نگاری کی روایت میں اپنے طرزِ بیان سے ایک منفرد مقام بنالیا۔ وہ اپنے خاکوں میں صاحب خاکہ کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے دوست واحباب ہی کے خاکے لکھے ہیں جس کے سبب ایک مکمل تصویر سامنے آتی ہے۔ وہ صاحب خاکہ کی شخصیت اور زندگی کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں اور دلچسپ واقعات کے ذریعے ایسا پیکر تراشتے ہیں جیسے انھوں نے خود دیکھا، سمجھا یا برتا ہے۔ ان کا اندازِ بیان نہایت شگفتہ اور مخلصانہ ہوتا ہے۔ انھوں نے 1968ء میں پہلا خاکہ یوسف خاں کا لکھا پھر یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا اور چار خاکوں کے مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ مجتبیٰ حسین اپنے خاکوں میں صاحب خاکہ کی جسمانی ساخت، لباس، وضع قطع، اخلاق و عادات، طرز معاشرت، انداز تکلم میں کوئی ایک خصوصی اور منفرد چیز تلاش کر لیتے ہیں اور اپنے شگفتہ اور دل پذیر اسلوب میں پیش کر دیتے ہیں۔ کنہیالال کپور کے دراز قد ہونے پر لکھی گئی تحریر سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''کنہیالال کپور کو جب بھی دیکھتا ہوں، قطب مینار کی یاد آتی ہے۔ مجھے فرق یہ نظر آیا کہ قطب مینار پر رات کے وقت ایک لال بتی جلتی رہتی ہے کہ ہوائی جہاز وغیرہ اُدھر کا رُخ نہ کریں۔ کپور صاحب پر رات کے وقت یہ حفاظتی انتظام نہیں ہوتا جو خطرے سے خالی نہیں۔ کیا پتہ کسی دن کوئی ہوائی جہاز اندھیرے میں کپور صاحب سے نبرد آزما ہوجائے اور ٹکرا کر پاش پاش ہوجائے''۔

سجاد ظہیر (بنّے بھائی) کی مسکراہٹ پر اتنی عمدگی سے تبصرہ کیا ہے جس میں صرف ان کی مسکراہٹ ہی نہیں بلکہ ان جملوں میں انسان کی ہنسی، قہقہوں اور مسکراہٹ کی تاریخ وتہذیب بھی سمائی ہوئی ہے۔

> ''میں سوچنے لگا، قدیم وحشی انسان کے غیر مہذب اور بے ہنگم قہقہے سے لے کر بنّے بھائی کی مسکراہٹ تک انسانی تہذیب نے جو نشیب وفراز دیکھے ہیں اور جو آگہی حاصل کی ہے وہی آگہی اصل میں بنّے بھائی کی مسکراہٹ ہے''۔

مجتبیٰ حسین اپنے خاکوں میں اصحاب خاکہ کی صفتوں، چھوٹی چھوٹی عادتوں، خصلتوں، تکیہ کلام، ہنسنے، رونے اور گفتگو کرنے کے انداز کی انفرادیت کو اپنے نہایت دلآویز اسلوب میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ شخصیت ہماری آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگتی ہے۔ عمیق مشاہدہ، انسانی نفسیات کا شعور اور اصحاب خاکے سے قربت کے سبب یہ خاکے

نہایت جاندار اور شخصیتوں کے حوالے سے یادگار بن گئے ہیں۔

مجتبیٰ حسین نے اکتوبر 1980ء میں یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کی جانب سے طباعت واشاعت کے موضوع پر جاپان میں منعقدہ ایک ورک شاپ میں ہندوستان کی نمائندگی کرتے ہوئے شرکت کی۔اس سفر کی روداد کو نہایت دلچسپ انداز میں جاپان چلو جاپان چلو میں پیش کیا یہ سفر نامہ اردو کے مزاحیہ سفرناموں میں ایک خاص مقام رکھتا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے کئی اور مما لک جیسے برطانیہ،فرانس،امریکہ،کینڈا،سعودی عرب،روس،تاشقند،سمرقند،بخارا،پاکستان،مسقط،دوبئی وغیرہ کا سفر کیا اور اپنے تجربات ومشاہدات کو''سفر لخت لخت'' کے عنوان سے قلمبند کیا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے انشائیے اور مضامین بھی لکھے ہیں جن میں ان کا انداز بیان نہایت سادہ وسلیس اور شگفتہ ہے وہ زندگی کے بڑے سے بڑے فلسفے کو عام فہم بنا کر پیش کرتے ہیں۔ان کی تحریروں کو پڑھنے سے زندگی کی بہت سی حقیقتوں کا انکشاف ہوتا ہے۔مجتبیٰ حسین نے اپنی تحریروں میں سماجی مسائل،نظم ونسق کی بدانتظامیاں،سیاسی مصلحتوں،معاشرتی بے اعتدالیوں،شخصی نااہلیوں،کمزوریوں،بداخلاقیوں کو طنزیہ وہ مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔طبقاتی کشمکش اور معاشی عدم توازن کی طرف وہ اپنے قارئین کی توجہ مبذول کراتے ہیں جو غالباً ان کی ترقی پسند تحریک سے نظریاتی وابستگی کا نتیجہ ہے۔انھوں نے اردو زبان وادب کی بدلتی صورت حال،ادب میں جدیدیت کے نام پر ہورہے تجربات،گھٹتے ادبی معیار پر طنز کے نشتر چلائے ہیں۔مجتبیٰ حسین کی تحریروں میں pathos کی کیفیت پائی جاتی ہے ان کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہنستے مسکراتے ہوئے قاری کی آنکھیں نم ہوجاتی ہیں وہ ہنسی ہنسی میں ایسی باتیں کرجاتے ہیں جو دل کو چھولیتی ہیں یہی ایک بڑے فنکار کی کامیابی کی علامت ہے۔

مجتبیٰ حسین کی تصانیف:

۱۔	تکلف برطرف (انشائیے)	1968
۲۔	قطع کلام (انشائیے)	1969
۳۔	قصہ مختصر (انشائیے)	1972
۴۔	بہر حال (انشائیے)	1974
۵۔	آدمی نامہ (خاکے)	1981
۶۔	بالآخر (انشائیے)	1982
۷۔	جاپان چلو جاپان چلو (سفر نامہ)	1983

۸۔	الغرض (انشائیے)	1987
۹۔	سو ہے وہ بھی آدمی (خاکے)	1987
۱۰۔	چہرہ در چہرہ (خاکے)	1994
۱۱۔	سفر لخت لخت (سفر نامے)	1995
۱۲۔	آخر کار (انشائیے)	1997
۱۳۔	ہوئے ہم دوست جس کے (خاکے)	1999
۱۴۔	میرا کالم (منتخب کالم)	1999
۱۵۔	مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں	2002
۱۶۔	مجتبیٰ حسین کے سفر نامے	2003
۱۷۔	مجتبیٰ حسین کے منتخب کالم	2004

مجتبیٰ حسین کی متعدد کتابیں ہندی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کی گئی ہیں۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ مجتبیٰ حسین نے پہلا خاکہ کس کا لکھا؟

۲۔ چہرہ در چہرہ کس نوعیت کی کتاب ہے؟

۳۔ جاپان چلو جاپان چلو کے علاوہ مجتبیٰ حسین کا ایک اور سفر نامہ کونسا ہے؟

3.6 'جاپان چلو جاپان چلو' مجتبیٰ حسین کی سفر نامہ نگاری کا جائزہ

مجتبیٰ حسین کی تصانیف میں دو کتابیں سفر ناموں پر مشتمل ہیں۔ ایک جاپان کا سفر نامہ ہے جو جاپان چلو جاپان چلو کے عنوان سے شائع ہوا اور دوسرا سفر لخت لخت جو کئی ملکوں کے اسفار مشتمل ہے۔ ان سفر ناموں میں بھی مجتبیٰ حسین نے اپنے شگفتہ اسلوب کو برقرار رکھا سفر نامہ جاپان چلو جاپان چلو پندرہ ابواب پر مشتمل ہے جس میں جاپان سے متعلق ساری اہم معلومات ہمیں ملتی ہیں جیسے وہاں کی تاریخ، جغرافیہ، تہذیب وثقافت، صنعتی ترقی، ادب، آرٹ، طرز معاشرت وغیرہ

سبھی کچھ شامل ہیں۔ جاپان میں اردو کی ترقی وترویج میں پروفیسر سوزوکی تاکیشی کی خدمات کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''اردو ماحول اور اردو تہذیب میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ انھیں دیکھ کر حسرت ہوتی ہے کہ اے کاش ہم بھی اردو کے لیے اتنا کچھ کر سکتے''۔

جاپان چلو جاپان چلو ان کا شاہکار سفرنامہ ہے جو ادب اور سیاحت کا حسین امتزاج قرار دیا جا سکتا ہے۔ 1980ء میں مجتبیٰ حسین نے یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کی جانب سے منعقدہ پبلشنگ کے ایک تربیتی کورس میں شرکت کے لیے جاپان کا سفر کیا، اور اس سفر کی روداد، اپنے تجربات، مشاہدات، قلبی کیفیات، جذبات واحساسات کو نہایت شگفتہ انداز میں سفر نامہ جاپان چلو جاپان چلو کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس سفرنامے میں مجتبیٰ حسین نے جاپان اور جاپانیوں کی امتیازی خصوصیات بڑے ہی دلکش انداز میں بیان کی ہیں۔

فنی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو مجتبیٰ حسین نے جاپان چلو جاپان چلو میں صورتِ حال، موازنہ، مبالغہ، حسن تعلیل، قول محال، تحریف نگاری اور زبان کے تخلیقی استعمال کے ذریعے مزاح پیدا کیا ہے۔ وہ قدم قدم پر جاپان اور ہندوستان کا موازنہ کرتے ہیں اور ہندوستانی قوم کی کمزوریوں، بے اعتدالیوں اور کوتاہیوں کو قول محال کے ذریعے کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قاری کبھی زیرلب مسکراتا ہے تو کبھی قہقہہ لگاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے جاپانیوں کی وقت کی پابندی کی عادت کے حوالے سے مختلف واقعات بیان کئے ہیں۔ اپنے تجربات ومشاہدات کی روشنی میں کہتے ہیں کہ وہاں عام آدمی ہو کہ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدے دار یا مہمان خصوصی سبھی وقت کی پابندی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے پروگراموں میں شرکت کرتے ہیں۔ جاپانی وقت کی پابندی کے اس قدر عادی ہوتے ہیں کہ وہاں وقت کا حساب گھنٹوں منٹوں میں نہیں بلکہ سکنڈوں میں لگایا جاتا ہے۔ چھوٹی سی چھوٹی تقریب کا اہتمام بھی وقت کی پابندی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں مجتبیٰ حسین نے ٹوکیو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں منعقدہ خیر مقدمی اجلاس کا تذکرہ کیا ہے۔ جس کا افتتاح اور اختتام مقررہ وقت پر ہوا تھا۔ مصنف طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ وہاں ہندوستان کی طرح کوئی وی آئی پی کلچر نہیں ہے اسی لیے تقاریب وقتِ مقررہ پر ہوتی ہیں۔

جاپانیوں کے اظہار تشکر کا خصوصی انداز اور اس کی طرزِ ادائیگی کا تذکرہ بھی مجتبیٰ حسین نے دلچسپ انداز میں کیا ہے جس میں ہندوستانی قوم اور جاپانی قوم کا تقابل مزاح کو تحریک دیتا ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ مصنف نے باتوں باتوں میں اس بات کا احساس دلایا ہے کہ کسی بھی ملک کے تہذیبی وثقافتی ادارے اور ان کی سرگرمیاں اس ملک کی نہ صرف شناخت ہوتی ہیں بلکہ قوم کا عظیم سرمایہ ہوتی ہیں جنھیں برقرار رکھنا اور اس ورثہ کو اگلی نسلوں تک پہنچانا اس ملک کے باشندوں کا اخلاقی فریضہ ہوتا ہے۔ سائنس وٹکنالوجی کے میدان میں برق رفتار ترقی کے باوجود جاپانی قوم نہایت خوبی

سے اس فریضے کو انجام دے رہی ہے۔

''دنیا بھر میں ہی وہ واحد قوم ہے جس نے مشینوں سے رشتہ جوڑنے کے باوجود اپنی تہذیب کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا صبح سے لے کر رات تک مشینوں اور اپنی تہذیب کے درمیان ایک خوشگوار ہم آہنگی پیدا کرنے میں مصروف رہتا ہے اور بالکل نہیں تھکتا، ثبوت اس کا یہ ہے کہ ایک جاپانی اپنی زندگی میں جتنے 'شکریے' ادا کرتا ہے وہ ہم چار جنم میں بھی ادا نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔۔ہم کسی کے احسان کو صرف 'شکریہ' یا 'دھنیہ واد' یا تھینک یو کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔لیکن جاپان میں جب تک ''دوموآرئی گاتوگزائی مشتہ' نہ کہیں تب تک محسن نہیں ٹلتا''

مجتبیٰ حسین جاپانیوں کی محنت اور لگن سے بہت متاثر نظر آتے ہیں امریکہ نے جاپان کے دو بڑے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی کو ایٹم بم کے ذریعے پوری طرح تباہ کر دیا تھا۔اس قوم کی محنت اور ڈیڈیکیشن قابل ستائش ہے کہ اس قوم نے ازسرِ نو ترقی کی۔اس قومی سانحے کے درد کو وہاں کے آرٹسٹوں نے اپنے فن میں زندہ رکھا' تاکہ وہ درد آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کرتا رہے۔اس سفر نامے میں مجتبیٰ حسین نے ایک ایسے مصور جوڑے کا تذکرہ کیا ہے جو زندگی بھر صرف اسی سانحے کی تصویریں بناتا رہا۔

''ہم جاپان کے سائیتما ضلع کے ایک گاؤں مشاسی رونزانگ میں پہنچے تو ایک جاپانی دوست میں ہمیں یہ مژدہ سنایا کہ جاپان کا مشہور آرٹس جوڑا ماروکی ایڈی اور ماروکی پاشی یہیں پاس میں رہتے ہیں۔ان کی پینٹنگس کا میوزیم بھی یہیں ہے۔ماروکی ایڈی اور ماروکی پاشی دونوں میاں بیوی ہیں۔دونوں آرٹسٹ ہیں اور دونوں نے زندگی بھر ہیروشیما کی بربادی کو پینٹ کیا ہے۔ہمیں جب یہ اطلاع ملی تو ہم نے فوراً کہا کہ ہم یہ میوزیم دیکھنا چاہتے ہیں۔ہمیں وہاں لے جایا گیا اور ہیروشیما کی تباہی کی پینٹنگ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا۔آپ سے کیا بتائیں کہ ہمارے دل پر کیا گزری ا۔یک ایک پینٹنگ کو دیکھتے تھے تو کلیجہ منہ کو آجاتا تھا ۔مسٹر ماروکی اب ۸۰ برس کے اور مسز ماروکی ۷۰ برس کی ہوگئی ہیں۔16 اگست 1945 کو جب ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا گیا تو دونوں میاں بیوی ٹوکیو میں تھے۔بم گرنے۔کے تیسرے دن یہ پہلی ٹرین سے ہیروشیما گئے جوان کا آبائی

munotes.in

شہر ہے۔ وہاں جو بربادی دیکھی تو فیصلہ کیا کہ زندگی بھر ہیروشیما کی تباہی کی تصویریں بناتے رہیں گے۔ اسی میوزیم کے برابر ان دونوں آرٹسٹوں کی رہائش گاہ ہے۔ اگرچہ یہ میوزیم ایک دیہات میں واقع ہے۔ مگر لوگ اسے دیکھنے کے لیے دھڑا دھڑ آتے ہیں۔ ہم بھی بڑی دیر تک اس میوزیم میں لگی تصویروں کے آگے اپنے سر کو ہلا ہلا کر داد دیتے رہے۔ داد دینے سے فرصت ملی تو ہم نے کہا کہ ہم ان دونوں آرٹسٹوں۔ سے ملنا چاہتے ہیں آرٹسٹوں کو خبر بھجوائی گئی کہ آرٹ کا ایک مشہور ہندوستانی ناقد آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ مسز مارو کی گھر پر موجود تھیں۔ فوراً اپنے گھر کے اندر بلایا۔ بڑی عزت سے بٹھایا۔ ہم نے ان کی تصویروں کی تعریف کی۔ یہ بھی کہا کہ آپ کی تصویریں دیکھنے کے بعد ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہیروشیما دیکھنے نہیں جائیں گے (یوں بھی ہمارے دور میں ہیروشیما جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا) ہم نے یہ بھی کہا کہ اب زندگی بھر عالمی امن کے لیے کام کرتے رہیں گے۔ وہ بہت خوش ہوئیں اور بولیں جنگ کی بربادی کے خلاف ہماری یہ ادنیٰ سی کوشش ہے۔ ہیروشیما پر ایٹم بم کے گرنے سے دولاکھ ساٹھ ہزار آدمی مرے تھے۔ مگر ہم اتنی بڑی ٹریجڈی پر صرف نو سو (۹۰۰) تصویریں ہی بنا سکے۔ اصولاً ہر مرنے والے کی ایک ایک تصویر ہونی چاہیے تھی۔''

مجتبیٰ حسین بار بار ہندوستان اور جاپان کا موازنہ کرتے ہیں اور اکثر معاملات میں جاپان بازی لے جاتا ہے لیکن جب فنون لطیفہ اور ادب کے میدان میں موازنہ ہوا تو ہندوستان کا پلڑا بھاری ہو گیا۔ جس پر مصنف کو فخر ہے کہ ان کے ملک میں کالیداس، کبیر داس، امیر خسرو، میر، غالب، اقبال جیسی نابغۂ روزگار شخصیتوں نے جنم لیا ہے، جن کی بدولت ادب کی تخلیق میں ہندوستان جاپان سے آگے ہے۔ جاپانیوں کی ساری توجہ سارا زور ٹیکنالوجی کی ترقی پر ہے مصنف اپنے جاپانی دوستوں کو ادب کی طرف توجہ مبذول کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے انسانی ذوق کی تسکین کے لیے ادب کی اہمیت و افادیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

''ٹرانزسٹروں یشیکا کے کیمروں ٹویوٹا اور ڈٹسن کی موٹروں کی دھوم ہے۔ مگر دنیا والوں کو جاپان کے ادیبوں فنکاروں آرٹسٹوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں

معلوم۔جاپان کے باہر کوئی ان کے نام نہیں جانتا۔جاپان کے ادب آرٹ اور کلچر کو بنانے والے ٹرانسٹروں، گھڑیوں، کیمروں اور موٹروں کے نیچے دب گئے ہیں ۔ہم نے کئی جاپانی فنکاروں سے مذاق مذاق میں کہا،میاں! چیزیں ضرور بناؤ مگر اتنی اچھی بھی نہ بناؤ کہ تم پس پشت چلے جاؤ۔چیزیں جاپان کی شناخت کا حصہ ضرور بنیں۔مگر تم بھی تو جاپان کی شناخت کا حصہ بنو۔ہم بھی چیزیں بناتے ہیں مگر یہ ہم سے زیادہ مقبول نہیں ہیں۔بھلے ہی ہمارے ٹرانسٹروں، کیمروں اور موٹروں کو کوئی نہ پوچھتا ہو مگر ہمارے کالی داس، کبیر میرا بھائی، امیر خسرو، غالب، میر، رابندر ناتھ ٹیگور اور ڈاکٹر اقبال کو ساری دنیا جانتی ہے۔جاپانی فنکار ہماری بات کو مذاق میں ٹال دیتے تھے۔ہوگی کوئی مصلحت ان کی۔''

مجتبیٰ حسین جاپانیوں کی محنت اور جستجو سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔کسی بھی ملک کی ترقی میں اس ملک کے عوام کی صلاحیتوں اور انتھک محنتوں کا بہت بڑا رول ہوتا ہے۔جب مصنف نے باتوں باتوں میں اس طرف بلیغ اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ جاپان میں اسلام کی ترویج کے پیچھے اسلامی ممالک سے رشتے استوار کرکے تیل حاصل کرنا تو نہیں ہے اس کے جواب میں جاپانی میزبان کا یہ کہنا کہ ہماری فیکٹریاں باہر سے برآمد شدہ تیل ہی سے نہیں چلتیں بلکہ ہمارا خون پسینہ بھی اس میں شامل ہے۔

''ایک دن ہم نے جاپان اسلامک کانگریس کے ایک عہدیدار سے باتوں باتوں میں کہا' حضرت جاپان کی معیشت کا سارا دارومدار عربوں کے تیل پر ہے۔یہ جو جاپانی اشیاء ساری دنیا میں اپنا ڈنکا پیٹتی پھر رہی ہیں انہیں بنانے والی فیکٹریاں سب تیل کی مدد سے چلتی ہیں۔آپ کے ہاں تیل نام کی کوئی چیز نہیں ہے یہ جو ٹوکیو راتوں کو جگمگاتا ہے یہ سب تیل کی کرامات ہیں۔کہیں ایسا تو نہیں کہ عربوں کے تیل کے حصول کے لیے جاپان میں اسلام اس قدر تیزی سے فروغ پا رہا ہو۔۔۔وہ بولے لاحول ولاقوۃ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ہم تو ہر شئے باہر سے درآمد کرتے ہیں ہمارے پاس کوئی قدرتی وسائل نہیں ہیں۔لوہا بھی آپ کے ملک سے منگاتے ہیں۔ ہماری تو صرف فیکٹریاں چلتی ہیں اور محض اس لیے چلتی ہیں کہ ہم محنت کرنا جانتے ہیں۔''

جاپان کے ان دو بڑے شہروں ہیروشیما اور ناگاساکو امریکہ نے آئٹم بم کے ذریعے برباد کر دیا تھا، اس قومی المیہ کو وہاں کے ایک آرٹسٹ جوڑے مارو کی ایڈی اور مارو کی پاشی نے اپنے فن کے ذریعے زندہ رکھا۔ اپنے وطن اور اہلِ وطن کو خراج عقیدت پیش کرنے کا یہ انوکھا انداز مصنف کا دل چھو لیتا ہے۔ ان دونوں مصوروں نے تمام عمر اس سانحے کی تصویریں بنا کر دنیا کو امن کا پیغام دیا اور جنگ سے ہونے والے نقصانات سے آگاہ کیا۔

جاپانی عوام جسمانی لحاظ سے پست قد ہوتے ہیں ان کی جلد ملائم اور چمکدار ہوتی ہے جس سے عمر کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ مجتبیٰ حسین نے جاپانیوں کے اخلاقی اقدار کے حوالے سے ایک معنی خیز جملہ لکھا وہ کہتے ہیں کہ جاپانیوں کا سب کچھ چھوٹا ہوتا ہے سوائے ان کے کردار کے۔ جاپانیوں کے اخلاق و کردار نے مجتبیٰ حسین کو بے حد متاثر کیا تھا۔

> ''جاپان کے 80 فیصد علاقے جزائر پر پھیلے ہوئے ہیں 20 فیصد علاقہ میدانی ہے جس پر سارے جاپانی مل جل کر رہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ادب میں ہمارا قد جو کچھ بھی ہے اس کے بارے میں آپ بخوبی جانتے ہیں۔ لیکن ہمارا جسمانی قد پھر بھی اتنا بلند نہیں ہے۔ بس پانچ فٹ گیارہ انچ کا قد ہے۔ پھر بھی ٹوکیو کی سڑکوں پر ہم نکلتے ہیں تو اپنی قدآور شخصیت کے باعث لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ کچھ جاپانی دوستوں کا کہنا ہے کہ جب سے ہم ٹوکیو آئے ہیں ٹوکیو بھرا پرا سا نظر آنے لگا ہے۔''

یہاں مصنف نے جسمانی قد و قامت اور ادبی قد کی مناسبت سے زبان کا تخلیقی استعمال کیا ہے اندازِ بیان کی خوبصورتی تحریر میں شگفتگی پیدا کرتی ہے۔ جاپانی قوم کو اپنی تہذیب اور زبان سے بے حد لگاؤ ہے۔ وہاں بچے اپنی مادری زبان میں پڑھتے ہیں ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ساری سہولتیں ان کی اپنی زبان میں دستیاب ہوتی ہیں۔ مادری زبان میں تعلیم مہیا کر کے جاپان نے دنیا میں سب سے ترقی یافتہ ملک کا درجہ حاصل کر لیا اور اس مفروضے کو غلط ثابت کر دیا کہ تکنیکی تعلیم کے لیے انگریزی زبان لازمی ہے۔ مادری زبان میں تعلیم طلبا کے لیے سہولت بخش ہوتی ہے اور اس سے ان کی اختراعی و تخلیقی صلاحیتوں کو جلا ملتی ہے۔ جاپانیوں نے اپنی زبان میں تکنیکی علوم منتقل کر کے اسے زندہ رکھا اور زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے قابل بنایا۔ انھیں اپنی زبان پر فخر ہے جس کے سبب وہ ایشیا کی دوسری قوموں کی طرح نہ احساس کم تری میں مبتلا ہے اور نہ ہی انگریزی زبان سے مرعوب ہے۔ مجتبیٰ حسین اس سفر نامے میں جاپانیوں اور ہندوستانیوں کے عادات و اطوار کا تقابل کرتے ہیں۔ کسی بھی ملک کی تاریخی عمارتیں اس قوم کا ورثہ اور قیمتی اثاثہ ہوتی ہیں۔ اس کا تحفظ اس قوم کا فریضہ ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین ہندوستانی عوام کے اجتماعی شعور میں اس کی کمی محسوس کرتے ہیں اور اسے طنزیہ و مزاحیہ

munotes.in

انداز میں بیان کیا ہے۔ان کے طنز میں اصلاحی مقصد پوشیدہ ہے۔ یہاں کس طرح تاریخی عمارتوں پر لوگ اپنے نام لکھتے ہیں۔ ہمارے تاریخی ورثے کی حفاظت کے بجائے اس پر طرح طرح کے نشان بنا کر نام لکھ کر ان کو خراب کر رہے ہیں ۔اس لاعلمی اور غیر ذمہ دارانہ حرکات سے غیر ملکی سیاحوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔حسن تعلیل اور تجاہل عارفانہ کے ذریعے جاپانی اسکالر کی زبانی ہندوستانیوں کے اس رویے کی مزمت ایک منفرد انداز میں کی ہے۔

''مسز شاشورے نے ہم سے پوچھا'' کیا کبھی حیدرآباد جاتے ہیں۔ہم نے اثبات میں جواب دیا تو بولیں'' اگلی بار آپ جب بھی حیدرآباد جائیں تو چارمینار کے پچھلی کمان والے اور لاڑ بازار کے برابر والے مینار پر میرا نام ضرور تلاش کریں میں نے اردو رسم الخط میں اپنا نام وہاں کھودا تھا۔

ہم نے کہا بی بی حیدرآباد میں اپنی زندگی کے بیس برس گزارنے کے باوجود آج تک ہم کبھی چارمینار پر نہ جاسکے اب آپ کی خاطر جائیں گے۔مگر یہ آپ کو اپنا نام وہاں لکھنے کی کیا سوجھی۔اب ہم بھی جواباً اپنا نام آپ کے ٹوکیوٹاور پر اردو رسم الخط میں لکھ کر جائیں گے۔

بولیں'' جاپان میں آپ یہ نہ کرسکیں گے۔کیوں کہ ہمارے یہاں عمارتوں کو تصنیف وتالیف کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔آپ کے ہاں یہ رواج ہے کہ جہاں کہیں کوئی تاریخی عمارت دیکھی اس پر اپنا نام لکھ دیا۔میں نے بھی چار مینار پر اپنا نام محض اس لیے لکھا تھا کہ وہاں چار پانچ اصحاب پہلے ہی سے اپنے ناموں کو کندہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔میں نے سوچا کہ شاید آپ کے ہاں ایسا کرنے کا دستور ہے۔اس کا جواب مسز شاشورے کو ہم کیا دے سکتے تھے۔لہٰذا خاموش ہوگئے۔''

'عمارتوں کو تصنیف وتالیف کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا' اس جملے میں طنز کی نشتریت ان بے کار حرکتوں کا احساس دلاتی ہے جو دنیا کے سامنے ہمیں شرمندہ کرتی ہیں اور ایک غیر مہذب قوم کے طور پر بدنام کراتی ہیں۔

زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مجتبیٰ حسین جاپان اور ہندوستان کے درمیان بالراست موازنہ کرتے نظر آتے ہیں۔لیکن جب ٹوکیو کے ایرپورٹ پر کسٹم آفیسر کی بیدری فن سے آراستہ اشیاء میں دلچسپی دیکھتے ہیں تو مبہم انداز میں ہندوستانی سماج میں پنپ رہے رشوت ستانی کے ناسور پر طنز کیا ہے۔

munotes.in

''وہ بولا آپ کی کی کتابوں کوئی اہمیت نہیں ، بے ضرر سی چیزیں ہیں۔ البتہ کچھ چیزیں ہیں جو سیاہ رنگ کی ہیں۔تب ہمیں خیال آیا کہ موصوف کا اشارہ بیدری صنعت کے سامان کی طرف ہے۔ہم جاتے ہوئے اپنے ساتھ بیدری صنعت کی کئی چیزیں جیسے جوتے میں بنے ایش ٹرے، بٹن ، ٹائی پن اور ڈبیاں لے گئے تھے۔اپنے جاپانی دوستوں کو تحفے کے طور پر پیش کرنے کے لیے۔ہم نے فوراً اپنا ہینڈ بیگ کھولا اور بیدری صنعت کا سامان نکال نکال کر اس کی خدمت میں پیش کرنے لگے۔ وہ حیرت سے انہیں دیکھتا رہا پھر بولا'' بہت خوبصورت چیزیں ہیں۔آپ ہندوستانی اتنی خوبصورت چیزیں کیسے بنا لیتے ہیں اور پھر مجھے حیرت ہے کہ اس دھات کا رنگ اتنا سیاہ کیسے ہو گیا۔

ہم نے اپنا سینہ پھلا کر کہا'' ایسی چیزیں بنانا ہم ہندوستانیوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔رہا یہ سوال کہ یہ دھات سیاہ رنگ کی کیسے بن گئی تو بھیا! یہ ہمارا ٹریڈ سکریٹ ہے۔اگر آپ کو بتا دیں تو ہماری کیا انفرادیت رہ جائے گی۔ہم نے بیدری سامان میں اس کی گہری دلچسپی دیکھ کر ایک ایش ٹرے اس کی خدمت میں پیش کرنے کی کوشش کی مگر اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ بہت سمجھایا کہ یہ تحفہ ہے اور ہمارے ہاں کسٹم آفیسروں کو تحفے پیش کرنے کا رواج عام ہی نہیں لازمی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے آپ بھی لے لیجئے۔وہ بولا'' نہیں جیسی آپ کی انفرادیت ہے ویسی ہماری بھی انفرادیت ہے''۔

جاپان جزائر پر مشتمل ایک چھوٹا سا ملک ہے وہاں کے لوگ اپنے ملک میں موجود وسائل کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کو جاپان میں ٹوکیو کے شاندار گرین ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ یہ ہوٹل تمام سہولتوں سے آراستہ تھا لیکن کمرہ حدود و اربعہ کے اعتبار سے مختصر تھا پانچ فٹ گیارہ انچ کے مجتبیٰ حسین جب پلنگ پر نیم دراز ہوئے تو ٹیلی فون کا چونگا ان کے سر پر بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو گیا اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔اس کے بعد ایک ساتھی مندوب نے رات میں چہل قدمی سے واپسی کے بعد کمرے میں داخل ہونے سے قبل مجتبیٰ حسین کو شب بخیر کہتے ہوئے گڈ نائٹ سویٹ ڈریمس جیسے رسمی کلمات ادا کیے تو مجتبیٰ حسین بے ساختہ کہتے ہیں ہے کہ محترمہ ہمارے کمرے میں اتنی بھی جگہ کہاں ہے کہ کوئی خواب داخل ہو سکے۔

munotes.in

مجتبیٰ حسین نے اس سفر نامے میں جاپانی قوم کی خوبیوں کو مختلف واقعات کی روشنی میں پیش کیا ہے ۔ جاپانی نہایت محنتی، مہذب، مخلص، بہ اخلاق، حسن پرست، وقت کے پابند، مہمان نواز ہوتے ہیں۔ ان کی شکریہ ادا کرنے کی عادت کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے:

''دنیا بھر میں یہی وہ واحد قوم ہے جس نے مشینوں سے رشتہ جوڑنے کے باوجود اپنی تہذیب کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ سارا جاپان صبح سے لے کر رات تک مشینوں اور اپنی تہذیب کے درمیان ایک خوشگوار ہم آہنگی پیدا کرنے میں مصروف رہتا ہے اور بالکل نہیں تھکتا۔ ثبوت اس کا یہ ہے کہ ایک جاپانی اپنی زندگی میں جتنے، شکریے ادا کرتا ہے وہ ہم چار جنم میں بھی ادا نہیں کر سکتے .... ہم کسی کے احسان کو صرف، شکریہ، یا دھنیہ واد، یا تھینک یو، کہہ کر ٹال دیتے ہیں لیکن جاپان میں آپ جب تک ''دوموآرکی گاتو گزائی مشتہ'' نہ کہیں تب تک محسن نہیں ٹلتا''۔

جاپان سے متعلق اتنی معلومات ہمیں اس سفر میں ملتی ہیں کہ اس مطالعے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے ہم نے جاپان کی سیاحت کی ہے۔ ایک دلچسپ ہمسفر کے ساتھ جس کی بصیرت سفر میں درپیش واقعات اور مشاہدات وتجربات کی روشنی میں انسانی رویوں سے ہمیں روشناس کراتی ہے۔ اس سفر نامے میں مصنف اپنے طنزیہ موازنے کے ذریعے ان خامیوں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے جو بحیثیت قوم ہم میں موجود ہیں۔ مجتبیٰ حسین انسانی قدروں کو سب سے اہم تصور کرتے ہیں ان کا طرزِ اسلوب اور شگفتہ بیانی قاری کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیرتی رہتی ہے۔ غرض اردو سفر نامے کی روایت میں جاپان چلو جاپان چلو ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے جس سے مجتبیٰ حسین کی فنی عظمت عیاں ہوتی ہے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ جاپان میں اردو کی ترقی کے حوالے سے مجتبیٰ حسین کس پروفیسر کی خدمات کا ذکر کیا ہے؟

۲۔ جاپان کے وہ کونسے شہر ہیں جو دوسری جنگ عظیم میں برباد ہو گئے تھے لیکن جاپانی قوم نے اپنی محنت و لگن سے انھیں از سرِ نو آباد کر دیا؟

۳۔ مسز شاشورے نے اس سفر نامے میں حیدرآباد کی کس تاریخی عمارت کا ذکر؟

3.7 بلٹ ٹرین میں کبھی نہ بیٹھو : اقتباس فہمی

مجتبیٰ حسین نے اس سفر نامے میں ہندوستانی اور جاپانی ٹرینوں کا موازنہ کر کے مزاح تخلیق کیا ہے۔ ہندوستان میں ریل گاڑیاں اکثر و بیشتر دیری سے چلتی ہیں جبکہ جاپان میں ریل گاڑیاں بہت تیز رفتار اور آرام دہ ہوتی ہیں اور مسافروں کو طے شدہ وقت پر منزل مقصود پر پہنچا دیتی ہیں۔ ان خوبیوں کو قول محال کے ذریعے مجتبیٰ حسین اس طرح بیان کرتے ہیں گویا یہ تو خامیاں ہیں اور کہتے ہیں کہ ریل گاڑی کے نام پر جاپانی ہوائی جہاز کا سفر کراتے ہیں اصل میں ریل کے سفر کا مزہ تو ہندوستان ہی آتا ہے۔ ہم ٹرین کا انتظار کرتے ہیں اور انتظار کا مزہ لوٹتے ہیں کیونکہ ہماری مشرقی شعری روایات میں انتظار کی کیفیت کو حظ سے جوڑا گیا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ انتظار کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ ہمارے یہاں سفر میں کھاتے پیتے اخبار کا مطالعہ کرتے ساتھی مسافروں سے سیاست، کرکٹ، مہنگائی اور معاشرتی صورتحال پر تبادلۂ خیال کرنے میں سفر کا جو لطف آتا ہے وہ اس ہوائی جہاز نما بلٹ ٹرین کے سفر میں نہیں آسکتا۔ ذیل کے اقتباس میں مجتبیٰ حسین نے ہندوستانی اور جاپانی ٹرینوں کا موازنہ کیا ہے جس میں انھوں نے حسن تعلیل (اصل وجہ نہ بتا کہ کوئی فرضی وجہ بیان کرنا) اور قول محال (دو متضاد کیفیتوں کو یکجا کرنا) کے ذریعے مزاح پیدا کیا ہے۔ اس میں تجاہل عارفانہ (جان بوجھ کر انجان بننا) بھی لطف پیدا کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو

> ''بلٹ ٹرین سے اترنے کے بعد ہمارے دوست شنجی تاجما نے پوچھا آپ کا سفر کیسا رہا' ہم نے کہا مسٹر تاجما آپ ہندوستان کی ٹرینوں میں سفر کر چکے ہیں ہماری ٹرینوں میں جو سہولتیں ہوتی ہیں وہ آپ کے ہاں کہاں۔ وہ سفر ہی کیا جس میں آدمی کو دھکا نہ لگے۔ ہم نے تین گھنٹے آپ کی ٹرین میں سفر کیا۔ کسی نے ہمارے سر پر صندوق نہیں رکھا۔ کسی کا ہولڈال ہمارے پاؤں پر نہیں گرا۔ کسی مسافر نے نشست کے لیے دوسرے مسافر سے لڑائی نہیں کی اور پھر وہ ہر اسٹیشن پر چائے لے لو، پان بیڑی سگریٹ والی مانوس آوازیں نہیں سنائی دیں۔ بھلا یہ بھی کوئی ٹرین کا سفر ہے۔۔۔۔
>
> لہٰذا صاحبو! کبھی جاپان جاؤ تو بلٹ ٹرین میں بالکل نہ بیٹھو، بڑی واہیات ٹرین ہے۔ بلٹ ٹرین میں بیٹھنے سے بہتر یہی ہے کہ آدمی ہوائی جہاز میں بیٹھ جائے۔''

تیز رفتار بلٹ ٹرینوں کی وقت کی پابندی پر لکھتے ہیں:

''ٹوکیو میں بھی ہمیں ایک بار ایک ٹرین سے سگاموا اسٹیشن جانا تھا اپنے ایک

> دوست سے ملنے کے لیے ،اسٹیشنوں کے نام جاپانی میں لکھے ہوتے ہیں کہیں
> کہیں انگریزی میں بھی لکھے ہوتے ہیں۔ چونکہ ہم اکیلے سفر کر رہے تھے۔اس
> لیے ایک صاحب سے سگامواسٹیشن کی پہچان پوچھی۔ان صاحب نے کہا کہ ۱۱
> بج کر ۳ منٹ پر جو بھی اسٹیشن آئے اس پر اتر جایئے گا وہ سگامواسٹیشن ہی ہوگا
> ۔اور ہم ٹھیک ۱۱ بج کر ۳ منٹ پر سگامواسٹیشن پر موجود تھے''

جاپانیوں کے مطالعے کی عادت کا ذکر نہایت شگفتہ انداز میں کیا ہے لکھتے ہیں کہ جاپانی قوم ایشیا کی سب سے پڑھا کو قوم ہے۔جاپانی بڑے ذوق وشوق سے مطالعہ کرتے ہیں یہاں تک کہ دوران سفر بھی مطالعہ کرتے ہیں اور ٹرین میں مطالعے میں غرق مسافروں کا منظر دیکھ کر مجتبیٰ حسین بے ساختہ کہتے ہیں کہ ٹرین کے کمپارٹمنٹ پر لائبریری کا گمان ہوتا ہے۔

> ''پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے کتابیں پڑھتے ہیں۔ٹرین آتی ہے تو کتاب میں
> انگلی رکھ کر ٹرین میں گھس جاتے ہیں اور سیٹ پر بیٹھتے ہی پھر کتاب کھول کر پڑھنے
> میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ہمیں اکثر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی لائبریری
> میں بیٹھے ہیں اور لائبریری کے نیچے پہیے لگا دیئے گئے ہیں۔جاپانی یا تو پڑھتے
> ہیں یا لکھتے ہیں''

مجتبیٰ حسین نے سفرنامے کے اس حصے میں جاپانی بلٹ ٹرین میں سفر کی روداد طنزیہ ومزاحیہ انداز میں بیان کی ہے۔جاپان اور ہندوستان کی ٹرینوں کا موازنہ کر کے ہندوستانی نظام کی کوتاہیوں پر اور بحیثیت قوم ہماری کمیوں اور غلط روایتوں پر طنز کیا ہے۔اور جاپانی قوم کی خوبیوں کو اس طرح اجاگر کیا ہے کہ قارئین اپنا محاسبہ کریں ان کا ذہن غور وفکر کی طرف مائل ہو جائے۔

3.8 خلاصہ

مجتبیٰ حسین اردو کے معروف طنز ومزاح نگار ہیں۔انھوں نے مزاحیہ اسلوب میں خاکے، انشائیے اور سفرنامے لکھے ہیں۔جاپان چلو جاپان چلو ان کا اہم سفرنامہ ہے۔ انھوں نے اکتوبر 1980ء میں یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کی جانب سے طباعت واشاعت کے موضوع پر منعقدہ ایک ورک شاپ میں ہندوستان کی نمائندگی کی خاطر جاپان کا دورہ کیا۔تقریباً 35 دن وہاں رہے اور بہت سے لوگوں سے ملاقات کی، کئی مقامات کی سیر کی نہایت باریک بینی سے جاپانی قوم کی زندگی کا مشاہدہ کیا۔جاپان کی ٹوکیو یونیورسٹی میں ان کے اعزاز میں ایک ادبی تقریب بھی منعقد کی گئی۔انھوں نے

munotes.in

اس سفر کی روداد جاپان چلو جاپان چلو کے نام سے قلمبند کی جس کا شمار اردو کے بہترین مزاحیہ سفرناموں میں ہوتا ہے۔طنز ومزاح نگار ہنسی ہنسی میں کام کی بات کہہ جاتا ہے مجتبیٰ حسین نے بھی ہندوستانی اور جاپانی قوم کا موازنہ کر کے بحیثیت قوم ہماری کمزوریوں اور کوتاہیوں کو اجاگر کیا ہے تاکہ ہم ہندوستانی ان خامیوں کی طرف متوجہ ہوں اور ان کی اصلاح کی طرف مائل ہو جائیں۔ یہ سفرنامہ ایسا ہے جو ہمیں صرف جاپانی قوم سے ہی واقف نہیں کراتا بلکہ ہمیں خود سے بھی روشناس کراتا ہے۔

3.9 نمونہ امتحانی سوالات

(ب) درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

ا۔ مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری پر اظہار خیال کیجیے

۲۔ مجتبیٰ حسین کی تعلیمی زندگی پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

۳۔ مجتبیٰ حسین کو کون کونسے انعامات واعزازت سے نوازا گیا۔

(الف) درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

ا۔ مجتبیٰ حسین کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالیے۔

۲۔ مجتبیٰ حسین کی ادبی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

۳۔ سفرنامہ جاپان چلو جاپان چلو میں مجتبیٰ حسین نے جاپانی قوم کی کون کونسی خصوصیات بیان کی ہیں۔

(ج) درج ذیل عبارات کی سیاق وسباق کے حوالے سے وضاحت کیجیے۔

ا۔ رہی یہ بات کہ تم باہر چلے گئے تو اس ملک کا کیا ہوگا، اس سلسلے میں ہمارا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں تمہارا باہر جانا نہایت ضروری ہے تاکہ ہمیشہ کے لئے تمہاری خوش فہمی دور ہو سکے۔''

۲۔ ہم نے دل میں سوچا کہ اے کاش ہمارے ملک میں بھی لوگ زبانوں کے معاملہ میں کم از کم اتنے ہی کاروباری ہوتے تو ہندی اور اُردو کا جھگڑا نہ ہوتا۔

3.10 فرہنگ

استفادہ کرنا	فائدہ حاصل کرنا
طبع آزمائی	ذہانت کا امتحان، لکھنا
وضع قطع	طور طریقہ
طرز معاشرت	رہن سہن کا طریقہ
انداز تکلم	بات چیت کا طریقہ
تشکیل دینا	شکل بنانا، ساخت، ترکیب
شگفتہ	کھلا ہوا، خوش، شادماں
مخلصانہ	خلوص کے ساتھ، سچی ہمدردی کے طور پر
تکیہ کلام	وہ لفظ جو گفتگو کے دوران میں عادت کے طور پر بار بار بولا جائے
نابغۂ روزگار	غیر معمولی قابل انسان
بلیغ	پورا، کامل
مصلحت	نیک صلاح، حکمت
اثاثہ	سرمایہ
تسکین	آرام دینا، اطمینان
اختراع	نئی بات نکالنا، ایجاد کرنا
بے ضرر	جو کوئی نقصان نہ پہنچائے
حدود اربعہ	چار سمتیں، لمبائی چوڑائی
اثبات	تصدیق
مندوب	نمائندہ، ممبر جو کسی خاص کام کے لیے بنایا گیا ہو
پس پشت	پیچھے کی طرف

munotes.in

3.11 معاون کتابیں

ا۔	انور سدید	اردو میں سفر نامہ کی روایت
۲۔	خواجہ اکرام الدین	اردو سفر نامہ کا تہذیبی و
۳۔	شکیل الرحمٰن	مجتبیٰ حسین کا فن
۴۔	حسن مثنیٰ	مجتبیٰ حسین اور فنِ مزاح نگاری
۵۔	رفیق جعفر	اردو ادب کے تین بھائی
٦۔	گل رعنا	مجتبیٰ حسین اور فنِ طنز و مزاح نگاری

☆☆☆

munotes.in

اکائی : 4 ۔ پروفیسر صغرا مہدی

ساخت :

4.1 اغراض ومقاصد

4.2 تمہید

4.3 صغرا مہدی کا عہد

4.4 صغرا مہدی کی حیات وشخصیت

4.5 صغرا مہدی کی ادبی خدمات

4.6 سیر کر دنیا کی، کے حوالے سے صغرا مہدی کے سفرنامہ نگاری کا جائزہ

4.7 خلاصہ

4.8 نمونۂ امتحانی سوالات

4.9 فرہنگ

4.10 معاون کتابیں

4.11 حواشی

4.1 اغراض ومقاصد

اس سبق کو پڑھنے کے بعد:

1۔ طلبا صغرا مہدی کا اردو ادب میں کیا مقام ہے اس سے روشناس ہوسکیں گے۔

2۔ طلبا صغرا مہدی کی حیات وشخصیت کی بازیافت کرسکیں گے۔

3۔ طلبا صغرا مہدی کی ادبی خدمات سے واقف ہوسکیں گے۔

4۔ طلبا ان کے سفرنامہ سیر کر دنیا کی غافل۔۔۔کا جائزہ پیش کرسکیں گے۔

5۔ طلبا اس قابل ہوجائیں گے کہ صغرا مہدی کے بارے میں اظہار خیال کرسکیں گے۔

6۔ طلبا ان کی زبان اور اسلوب کی بازیافت کرسکیں گے۔

munotes.in

4.2 تمہید

اردو ادب میں خواتین کے کردار سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ہر دور میں خواتین زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے شانہ بہ شانہ کھڑی نظر آتی ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اردو ادب کی ترقی میں عورتیں پیچھے رہ جائیں۔ عورتوں نے دیگر شعبہ جات کی طرح اردو ادب میں بھی اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔

اردو کی بقاء میں خواتین نے اہم رول ادا کیا ہے۔ تاریخ ادب اردو کا جائزہ لیا جائے تو اردو ادب میں خواتین اہم کردار ادا کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ بات دیگر ہے کہ بعض وجوہات کی بنا پر لاتعداد خواتین کے نام، ان کی کوششیں، صلاحیتیں منظر عام پر نہیں آئی ہیں۔ پروین شاکر، عفت موہانی، جیلانی بانو، قرۃ العین حیدر، عطیہ پروین، ہاجرہ شکور، بانو سرتاج، عصمت چغتائی، امرتا پریتم، مسرور جہاں، رفیعہ منظور الامین، صغریٰ مہدی، امراؤ جان ادا، زہرہ نگاہ، ساجدہ زیدی، انجم رہبر اور واجدہ تبسم اردو ادب کے وہ نام ہیں جن پر اردو کو ناز ہے۔ انہی میں ایک اہم نام صغرا مہدی کا ہے۔

اس اکائی میں صغرا مہدی کی حیات وشخصیت اور ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

4.3 صغرا مہدی کا عہد

افسانہ نگاری ہو یا ناول نگاری یا پھر طنز ومزاح اور سفر نامے، نثر نگار خواتین میں صغرا مہدی کا ایک اہم مقام ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ خواتین کی بہتر زندگی اور سماج میں ان کے ایک مقام کی خواہش مند رہی ہیں۔ علی گڑھ میں بی۔ اے کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں تب سلمی صدیقی ان کی اردو کی استاد تھیں۔ ان کی ہمت افزائی سے صغرا مہدی کے قلم نے اپنی شناخت بنالی۔

صغرا مہدی کے عہد کے مشہور ادبا میں ہندوستان کے مشہور طنز ومزاح نگار یوسف ناظم اور مجتبی حسین کو نام قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر صغرا مہدی جیسی ادبی شخصیت کے ہم عصر بہت سے سفر نامہ نگار بھی ہوئے ہیں۔ جن کے سفر ناموں کی بھی ادبی اہمیت ہے۔ ان سفر نامہ نگاروں میں قاضی مشتاق احمد کے آٹھ سفر نامے بہت مشہور ہیں، نگار عظیم کا سفر نامہ گرد آوارگی، علی احمد فاطمی کا سفر نامہ جرمنی میں دس روز قابل توجہ ہے۔ لالی چودھری کے سفر نامے مرتبہ ڈاکٹر رفیعہ سلیم اردو سفر ناموں میں قابل ذکر ہے۔ عارف نقوی کا راہ الفت میں گامزن، جوگندر پال کا پاکستان یاترا ابھی معروف سفر نامہ ہے۔

munotes.in

4.4 صغرا مہدی کی حیات وشخصیت

صغرا مہدی دسمبر 1939ء کو بھوپال کے قریب قصبہ باڑی میں پیدا ہوئیں۔ان کا اصل نام امانت فاطمہ تھا۔ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلا تعلیم کے لیے وہ دہلی آ گئیں۔جامعہ ملیہ اسلامیہ سے بی.اے کیا اور پھر انھوں نے 1961ء میں بی.ایڈ کیا جس کے بعد ایک معلّمہ کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا، پھر اکبرالہ آبادی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ پیش کر کے پی ایچ.ڈی کر لیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اُردو میں استاد ہو گئیں۔ریڈر بنیں اور پھر شعبہ اردو کی پروفیسر اور صدرِ شعبہ بھی مقرر ہوئیں اور یہیں سے ریٹائر ہوئیں۔پروفیسر صغریٰ مہدی درس وتدریس کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ علمی وادبی کاموں میں بھی مصروف رہیں۔انھوں نے تین درجن سے زیادہ کتابیں تصنیف وتالیف کیں۔

صغرا مہدی کا اصل نام امانت فاطمہ تھا۔سات بہن بھائیوں میں درمیان کی اولاد تھیں۔دو بھائی اور ایک بہن چھوٹے اور تین بہنیں بڑی۔ظاہر ہے درمیان کی اولاد ویسے بھی دونوں طرف سے دباؤ میں رہتی ہے۔بڑوں کا دباؤ اور چھوٹوں کی ذمے داری، ایسے میں اپنے لیے کوئی راہ، وہ بھی علاحدہ ناممکن ہی ہے۔لیکن صغرا مہدی نے اس ناممکن کو ممکن بنا کر اپنا نیا جہاں آباد کیا۔صغرا مہدی نے بچپن سے اپنی دنیا کو اس روپ میں دیکھنا پسند کیا جیسا کہ وہ چاہتی تھیں۔وہ دنیا انھیں قبول نہیں تھی جیسا کہ تھی۔لکھتی ہیں:

> مجھے کھیلوں سے دلچسپی نہیں تھی، کھیل سے چپکے سے نکل کر گوشہ تنہائی تلاش کر لی جہاں بیٹھ کر اکیلے خود سے باتیں کرتی۔میری اپنی خیالی دنیا تھی، جو اس دنیا سے بالکل الگ تھی۔اس میں بسنے والے سب لوگ وہی تھے جو حقیقی دنیا میں میرے ساتھ یا آس پاس تھے۔مگر وہ ایسے تھے جیسا میں چاہتی تھی کہ ہوں۔اس دنیا میں ہر وہ بات تھی جو مجھے پسند تھی۔"(۱)

ہر فرد اپنے ماحول میں جیتا ہے پرورش پاتا ہے پروان چڑھتا ہے اور یہی بنیاد اس کی زندگی کی عمارت کی بنیاد ہوتی ہے۔صغرا مہدی کے مزاج کا کھرا پن اور کھردرا پن انھیں اپنی زندگی کے حالات سے میسر آیا۔ان کے والدین کی عمروں میں بہت فرق تھا اور مزاجوں میں بھی ماں باپ کے درمیان چھوٹی چھوٹی باتیں وجہ اختلاف بن جاتیں۔صغرا مہدی کی اماں دادی جان کو سخت ناپسند کرتی تھیں جو رشتے میں ان کی بڑی چچی بھی لگتی تھیں۔وہ بہت تیز مزاج اور سخت گیر بھی تھیں۔ایسے میں صغرا مہدی کا معصوم بچپن اپنی نئی من پسند دنیا آباد کر کے تمام ناگواریوں سے فرار حاصل کر لیتا۔

بھوپال سے سات میل دور قصبہ باڑی میں اپنے خاندان کے زیر سایہ ان کا بچپن بیتا۔بارنا ندی نے اس قصبے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔کسی وقت یہاں گونڈ بھیل راجاؤں کی حکومت تھی۔صغرا مہدی کے والد (میاں) سید علی مہدی اسی

علاقے میں سب انسپکٹر تھے۔ تھانے سے ملا ایک مردانہ مکان جسے پرانے وقتوں میں مردان خانہ کہا جاتا تھا، بھی تھا جو عارضی قید خانے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ یہاں مجرم رکھے جاتے تھے۔ علاقہ بے حد خوبصورت ہرا بھرا پھولوں کی وادیوں سے گھرا ہوا تھا۔ ندی نے اس علاقے کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیے تھے۔ یہیں ہری ہری گھاس میں لال لال بیر بہوٹیاں دیکھتے ہوئے رنگ برنگی تتلیاں پکڑتے ہوئے رات کے اندھیرے میں جگنوں پکڑ پکڑ کر دامن میں بھرتے ہوئے اور کبھی کبھی شیر بھی دیکھتے ہوئے، ہرے بھرے کھیتوں میں دور تک پھیلے ہوئے دھوپ کے ساتوں رنگ آنکھوں میں بسائے قدرت کی گود میں صغرا مہدی کا بچپن قلانچے بھر رہا تھا۔

صغرا مہدی سب بہن بھائیوں میں زیادہ معمولی شکل وصورت کی تھیں۔ اوپر سے چیچک کے داغ بھی بسیرا کر کے بیٹھ گئے۔ دبلی پتلی کالی سوکھی اور چیچک کے داغ بھرے چہرے نے احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ سونے پہ سہاگا گھر اور باہر کے لوگ چڑانے لگے تھے کہ تم اماں اور میاں کی بیٹی نہیں ہو بلکہ تمھیں کسی جمعدارنی سے گود لیا ہے۔ ایسے میں صغرا کے معصوم دل پر کیا گزرتی ہوگی؟ صغرا کے والد صغرا کی والدہ سے دس برس بڑے تھے اور انسپکٹر بھی تھے۔ ظاہر ہے مزاج میں سختی اور تناؤ بھی رہا ہوگا۔ حاکمانہ انداز ہوگا شاید اسی سبب میاں اور اماں کے درمیان ہمیشہ تناؤ کی صورت رہتی۔ صغرا نے ایسی صورت میں خود کو کمتر محسوس کر کے نظر انداز نہیں کیا بلکہ یہی وہ حالات تھے جب امامت فاطمہ کے اندر صغرا مہدی پروان چڑھ رہی تھی۔ ایسے میں صغرا مہدی اپنی ایک خیالی دنیا آباد کر لیتی تھیں جس میں وہ خوبصورت، ذہین، پڑھی لکھی اور سب کی چہیتی لڑکی بن جائیں۔ ایک آئیڈیل گھران کے ذہن میں تیار ہوجاتا اور اپنی پسند کے مطابق کردار، ساز وسامان، آرائش، زیبائش، لباس اور جو وہ چاہتیں تیار ہوجاتا۔۔۔ واہ صغرا مہدی۔۔۔ واہ۔ کیا اس سب سے ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ تخلیق کار صغرا مہدی پیدا ہو چکی تھیں۔ جس میں وہ کہانی کار بھی تھیں اور کردار بھی۔

یوں تو صغرا مہدی کی بڑی بہن سیدہ فرحت کو شاعری سے نہ صرف شغف تھا بلکہ وہ نظمیں اور غزلیں بھی کہتی تھیں اور گاتی بھی تھیں۔ چھوٹے بھائی اقبال مہدی بھی آگے چل کر افسانہ نگار بنے لیکن صغرا مہدی کی بات ہی الگ تھی۔ ان کا بچپن بھی انوکھا تھا جوانی بھی نرالی اور ضعیفی بھی منفرد و مختلف جو کبھی آئی ہی نہیں۔

صغرا مہدی کی تعلیم وتربیت اور ادب سے وابستگی اپنے ماموں جان (ڈاکٹر عابد حسین) اور ممانی صاحبہ (صالحہ عابد حسین) کے زیر سایہ دہلی اور علی گڑھ میں ہوئی۔ یہاں کا کھلا ماحول انھیں نہ صرف راس آیا بلکہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے اجاگر ہونے میں بہت سازگار ثابت ہوا۔ وہ باقاعدہ افسانے لکھنے لگی تھیں۔ سب بہن بھائی پڑھ لکھ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ شادیاں ہو رہی تھیں۔ گھر آباد ہو رہے تھے لیکن صغرا مہدی نے یہاں بھی غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ لکھتی ہیں،

ممانی جان کو اور خاندان کے دوسرے لوگوں کو میری شادی کی بھی فکر تھی۔ میں نے

> اس سلسلے میں معمول کے خلاف اپنے خیالات ماموں جان سے شیئر کیے کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے لکھنے کا شوق ہے۔ میں نے چھوٹی چھوٹی کہانیاں اور اپنا پہلا ناول 'پابہ جولاں' لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ماموں جان نے میرے خیال کو رد نہیں کیا بلکہ یہ کہا کہ "تنہا زندگی گزارنا مشکل ہے۔ اگر تم یہ چاہتی ہو تو پھر ابھی سے اس کی تیاری شروع کر دو، اپنے کو پر اعتماد رکھو۔ اگر تم اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن رہیں تو میں کبھی تمھیں شادی پر مجبور نہیں کروں گا۔ مگر شادی کے دروازے بند نہ کرو۔" (۲)

اپنے ماموں جان کے نصیحت آمیز یہ جملے صغرا مہدی کے لیے مشعلِ راہ بن گئے۔ انھوں نے خود کو پر اعتماد بنایا خوش اور مطمئن رہنا اپنا شعار بنایا۔ زندگی اپنے ڈھنگ سے جینا سیکھا اور تنہا زندگی گزارنے جیسے مشکل مرحلے سے وہ بہ حسن وخوبی شاد ماں گزریں اور کیا پتہ انھوں نے کوئی خیالی شہزادہ بھی شوہر کے روپ میں بنا کر اپنی دنیا میں آباد کر رکھا ہو کیوں کہ ان کی خیالی دنیا بہت پاورفل تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھیں زندگی میں دقتیں درپیش نہیں آئیں۔ آئیں، انھوں نے ان کا مقابلہ کیا۔ لکھتی ہیں،

> "میں نے شروع سے ہی سوچ لیا تھا کہ سوسائٹی کے Norms سے ہٹ کر جو کام کیا جائے اس کی قیمت چکانی پڑتی ہے اس لیے اس سلسلے میں جو مشکلات پیش آئیں ان کا یہی سمجھ کر سامنا کیا۔" (۳)

صغرا مہدی کے والد زیادہ تر ملازمت کے سلسلے میں اپنے دوروں پر رہتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت باہر ہی گزرتا۔ گھر اور بچوں سے ان کو کم ہی واسطہ رہتا۔ والدہ اکثر بیمار رہتی تھیں۔ ذہنی طور پر بھی پریشان رہتی تھیں لیکن اس کے باوجود وہ ایک اچھی خاتونِ خانہ تھیں۔ کھانا اچھا پکاتی تھیں۔ بہت اچھی منتظم تھیں۔ بے حد دلچسپ گفتگو کرتی تھیں۔ شوخ تھیں۔ لوگوں کو ہنساتی تھیں۔ ملنسار تھیں۔ لوگوں کو تحفے تحائف دینے کا بھی شوق تھا مگر جب موڈ خراب ہوتا تو پھر ان کی ہر چیز سے دلچسپی ختم ہو جاتی اور گھر کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ اپنی اماں کی یہ تمام خصوصیات صغرا مہدی میں موجود تھیں۔ ہاں ان کے اچھا کھانا پکانے پر ضرور شبہ کیا جا سکتا ہے۔ اس ناچیز کو ان کے یہاں بہت لذیذ کباب اور چپاتی ایک ادبی نشست میں کھانے کا اتفاق ہوا۔ گول اور پتلی چپاتیاں خوش ذائقہ مناسب مسالحہ والے کباب یقیناً صغرا مہدی نہیں پکا سکتی تھیں کیوں کہ اتنی مناسبت تو ان کے اندر تھی ہی نہیں۔ اس میں یا تو ان کی بھابی شمع صاحبہ (اقبال مہدی کی بیوی) یا پھر کسی ملازمہ کا ہاتھ ضرور لگا ہوگا۔ ویسے اقبال مہدی نے ان کے کھانے پکانے اور گرہستی جمانے کے ذوق کو بڑے دلچسپ انداز میں قلم بند کیا ہے۔ لکھتے ہیں،

munotes.in

'ایک زمانہ تھا کہ آپا کھانا پکانے کے نام پر صفر تھیں اور آج خدا کی شان کہ وہ طرح طرح کے کھانے پکاتی ہیں اور ستم یہ بھی ہے کہ لوگوں کی دعوتیں بھی کرتی ہیں۔ گھر بھی صاف ستھرا رکھنے کی خواہش کرتی ہیں اور اگر ضرورت ہو تو عیب کو چھپانے کے لے ے پیوندکاری کے فن سے بھی واقف ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ آرٹ کا 'ٹچ' ہے۔ کھانا بنانے کے لیے کسی مغلانی بیگم کے دسترخوانی نسخے کی ضرورت نہیں۔ جیسی بے ساختہ خود ہیں اسی طرح خود ساختہ ڈشیں بناتی ہیں۔''

صغرا مہدی واحد ایسی خاتون تھیں جو تنہا ہوتے ہوئے بھی مکمل انجمن تھیں۔ ہمیشہ بھیڑ میں گھری ہوتیں۔ محبتیں لٹاتیں، ڈانٹ پھٹکار سناتیں، گلے سے لگاتیں، دعوتیں کرتیں، نصیحتیں کرتیں، دوستی کا دم بھرتیں اور سب کے دل میں گھر کر لیتیں۔ ہر چھوٹے بڑے سے ملنا اس کا دل رکھنا انھیں خوب آتا تھا۔ تعریف وتنقید اور انعام واکرام سے بے نیاز رہنے والی صغرا مہدی ہمیشہ خاموشی سے اپنے تخلیقی کاموں میں منہمک رہیں۔ اردو اکادمی دہلی نے ان کی کاوشوں پر فکشن ایوارڈ سے نوازا لیکن حقیقت میں وہ بڑے ایوارڈ کی حقدار تھیں۔ ان کے افسانے اور ناول ہمارے سماج کی بنتی بگڑتی تصویروں کا عکس ہیں جس میں عورت کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ مزاج کی طرح ان کی فکری بصیرت بھی منفرد تھی۔ صرف تحریر ہی نہیں انھوں نے حقوقِ نسواں اور تعلیم نسواں کے لیے آواز بھی بلند کی۔ یک طرفہ فتوے دینے والے فیصلوں پر اعتراض بھی کیا۔

قرۃ العین حیدر اور صغرا مہدی کے نزدیکی مراسم تھے جب کہ دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ عینی آپا خود پسند اور تنہائی پسند تو صغرا مہدی بالکل پلٹ۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صغرا مہدی نہ صرف تہذیبی قدروں سے جڑی تھیں بلکہ اسے نبھانا بھی خوب جانتی تھیں۔ سہیلیوں کے گروپ میں تاباں صاحب کی بیٹی عذرا باجی کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ پکی سہیلیاں! پروفیسر خالد محمود لکھتے ہیں،

''صغرا آپا کی شوخیاں اور شرارتیں جامعہ بھر میں مشہور ہیں۔ صغرا آپا اور عذرا باجی کی جوڑی کو خدا سلامت رکھے، ایک زمانے میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ کون تھا جو ان کی زد سے بچا ہو۔ آج بھی یہ دونوں مل جائیں تو شریر سے شریر بچے کے کان کاٹتی ہیں، مشاعروں میں یہ دونوں پیچھے بیٹھ کر وہ ہوٹنگ کرتی ہیں کہ اللہ میاں بھی شاعروں کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ مرنے کے بعد تو شاعروں کو دوزخ میں جانا ہی ہے، مشاعروں میں یہ دونوں ان کی زندگی بھی دوزخ بنا دیتی ہیں۔

صغرا مہدی کی زندگی پر نظر ڈالی جائے تو مختلف احساس ذہن کے پردے پر نمایاں ہوتے ہیں۔ کبھی لگتا ہے ان

کی زندگی کسی طویل داستان کا ایک حصہ تھی اور وہ اس کی اہم کردار، اپنا رول بہ حسن وخوبی ادا کر کے وہ دور آسمانوں میں کہیں گم ہوگئیں۔ وہ اپنی بے شمار یادوں، باتوں، قہقہوں اور تحریروں کے ذریعے ہمیشہ ہمارے درمیان رہیں گی۔ ادبی دنیا میں ویسے بھی دور دور تک اب کوئی صغرا نہیں۔ اردو کی یہ مشہور وممتاز ادیب، افسانہ نگار اور ناول نگار 17 مارچ 2014ء کی صبح اس دار فانی سے رخصت ہوگئیں۔ اُن کی تدفین بعد نمازِ ظہر جامعہ قبرستان میں عمل میں آئی۔ صغرا مہدی نے ادب کے تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی تھی مگر ان کی شناخت ایک فکشن نگار کی ہی رہی، آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی تحریریں انہیں کافی عرصے تک قاری کے دل ودماغ میں محفوظ رکھیں گی۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ صغرا مہدی کی کب اور کہاں پیدائش ہوئی؟

۲۔ صغرا مہدی کی فکشن نگاری کے بارے میں اظہار خیال کیجئے۔

۳۔ صغرا مہدی کی زندگی کے بارے میں مختصر انداز میں لکھیے۔

4.5 صغرا مہدی کی ادبی خدمات

بیسویں صدی کے نصف آخر میں جن چند خواتین نے اردو زبان وادب میں اپنا مقام بنایا، ان میں ایک نام پروفیسر صغرا مہدی کا بھی ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں میں ان کا ایک اہم مقام اس لئے بھی ہے کہ وہ ہمیشہ ہی عورت کی بہتر زندگی اور سماج میں ان کے مقام کے تئیں بیدار رہی ہیں۔ صغریٰ مہدی نے اردو ادب سے لگاؤ وراثت میں پایا۔ اردو کے مشہور ادیب، دانشور اور مفکر ڈاکٹر عابد حسین ان کے ماموں تھے اور مشہور افسانہ وناول نگار صالحہ عابد حسین ان کی ممانی تھی۔ لہٰذا بچپن ہی سے موصوفہ ان کے ساتھ رہیں اور انہیں کی ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی کی بدولت انہوں نے ادب میں اپنا ایک اہم مقام بنایا۔ صغریٰ مہدی کی پیدائش بھوپال میں ۱۹۳۸ میں ہوئی۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو سے بھی منسلک رہیں۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۹ میں کیا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''پتھر کا شہزادہ'' ۱۹۷۵ میں شائع ہوا۔ اس کے یکے بعد دیگرے ''جو میرے وہ راجا کے نہیں'' (۱۹۸۷)، ''پہچان'' (۱۹۹۵) اور ''پیش گوئی'' (۲۰۰۵) میں شائع ہوئے۔ افسانے کے علاوہ انہوں نے پانچ ناول (پابہ جولاں''، ''دھند''، ''پروائی''، ''راگ بھوپالی'' اور ''جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو'')، تین تنقیدی کتابیں (اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ، اکبر الہ آبادی اور اردو ناولوں میں عورت کی سماجی حیثیت) اور بچوں کی تین کتابیں (بعنوان

munotes.in

بچوں کے عابد حسین، بچوں کی صالحہ عابد حسین اور بچوں کے ابّا جان اکبر الہ آبادی) کے علاوہ بہت سی کتابوں کے ترجمہ کیا۔ان کا ہندی افسانوی مجموعہ ''غلابوں والا باغ'' شائع ہوکر ہندی ادبی حلقے میں داد وتحسین حاصل کر چکا ہے۔

صغریٰ مہدی نے پہلی کہانی بچوں کے رسالے ''کھلونے'' کے لیۓ لکھی جس کا عنوان ''ہمت کا پھل تھا'' اس وقت وہ آٹھویں جماعت کی طالبہ تھیں۔اس کے بعد ان کی تخلیقات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا اور ''بیسویں صدی''، ''بانو''، ''آج کل'' اور ''سب ساہتیہ'' وغیرہ جیسے مشہور رسالوں میں ان کے افسانے متواتر شائع ہوئے۔

صغریٰ مہدی کے افسانوں کے موضوعات زیادہ تر عورت اور اس کے مسائل کے گرد طواف کرتے ہیں۔ان کے افسانے ان نقطوں کو اٹھاتے ہیں جہاں عورت آزاد نہیں ہے وہ کسی اور کی ملکیت ہے چاہے وہ باپ اور بھائی کی صورت میں ہو یا پھر شوہر اور سسرال کی۔کیا وہ اپنی کوئی شناخت یا پہچان رکھتی ہیں یا نہیں ان کے کردار کے ذہن میں بار بار یہ سوال گردش کرتے رہتا ہے۔وہ عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر خاموش رہنا پسند نہیں کرتیں۔انہوں نے عورت کے ساتھ رواں رکھے جانے والے رویۓ اور معاشرتی نظریات کو جہاں تنقید کا نشانہ بنایا ہے وہیں مرد کی فطرت اور عورت کے تیئں اس کے سلوک اور دھوکہ دہی کو بھی فنکاری سے پیش کیا ہے۔صغریٰ نے کوٹھیوں میں رہنے والے نوابوں اور سرمایہ داروں کے چہرے سے اصلی نقاب ہٹانے کی کامیاب کوشش کی جو عورت کو عورت سمجھنے کے بجائے ایک داستہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔مرد کی بے وفائی اور خودغرضی پر ''زخم بھی''، ''مرہم بھی''، ''ملبہ''، ''کہانی پارو کی''، ''ساتویں بیٹی'' اور ''نمک حرام'' وغیرہ جیسے اچھے اور معیاری افسانے لکھے۔اس ضمن میں کملیش ان کے افسانوی مجموعے ''جو میرے وہ راجا کے نہیں'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''صغریٰ کی اور کہانیوں اور ناولوں کی طرح اس مجموعے (جو میرے وہ راجا کے نہیں) کی زیادہ تر کہانیاں ان کی زندگی کے ان پہلوؤں کے گرد گھومتی ہیں، جہاں اس کا وجود آزاد نہیں ہے۔اس مجموعے کی اکثر کہانیوں میں ہندوستانی ناری اسی طویل اور کٹھن راستے پر چلتی دکھائی دیتی ہے۔اپنی جگہ کھوجتی، اپنی پہچان بناتی قدم قدم پر اس کی قیمت چکاتی اور اس راہ میں جو کرب اسے سہنا پڑ رہا ہے۔اس کو نہ صرف صغریٰ نے محسوس کیا ہے بلکہ اس کو اچھے ڈھنگ سے پیش بھی کیا ہے۔''

صغریٰ نے اپنے افسانوں کا ماحول زیادہ تر گھریلو زندگی سے اخذ کیا ہے۔اس میں موجود انسانی رشتے، اخلاق و بھائی چارگی، تہذیب و معاشرت کے اُتار چڑھاؤ اور خامیوں کو انہوں نے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں بھی زیادہ تر معاشرتی اور تہذیبی گراوٹ کے نقوش اُبھرتے ہیں۔انہوں نے جو کردار تراشے ہیں وہ

جدید دور کے معاشرتی کردار ہیں جو اچھے ماحول سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی کسی نہ کسی مسئلے میں الجھ کر مسائل کے شکار ہو گئے ہیں۔ ''بن باس''، ''نمک حرام''، ''چوراہا''، ''چوتھا گھونٹ''، ''سمجھوتہ''، ''فیصلہ'' اور ''آخر کیوں'' وغیرہ اس قبیل کے افسانے ہیں۔ ''بن باس'' ان کا اچھا اور معیاری افسانہ ہے جس میں انہوں نے ہندوستان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اندر پھیلی برائیوں کی نشاندہی کی ہے۔

صغرا مہدی ایسی قلمکار ہیں جس نے اپنا تعلق صرف قول و قلم تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ یونیورسٹی کی سطح پر درس و تدریس کے ساتھ ساتھ سماجی کاموں میں بھی دامے درمے قدمے سخنے سرگرمِ عمل رہی ہیں۔ درس و تدریس کا کام انھوں نے عبادت سمجھ کر انجام دیا۔ اب وظیفہ یاب ہونے کے بعد سے خرابی صحت کے باوجود اپنے آپ کو پوری تندہی اور انہماک کے ساتھ خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والی فلاحی تنظیموں سے وابستہ کر رکھا ہے۔ یہ سب نہ ہوتا تو ان کے افسانوں کی تعداد شاید موجودہ تعداد سے کئی گناہ زیادہ ہوتی لیکن ان کے نزدیک یہ سارے کام بھی بہت ضروری ہیں۔

صغریٰ مہدی کی تعلیم و تربیت ڈاکٹر عابد حسین جیسے وسیع النظر دانشور اور صالحہ عابد حسین جیسی مشرقی اقدار کی پاسبان فکشن نگار خاتون کے سایہ عاطفت میں ہوئی۔ اسی کے ساتھ انھوں نے جامعہ کی مشترکہ تہذیبی وراثت کے چمن کی آبیاری میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جو قومی یکجہتی، رواداری، خدمت و ایثار اور شائستگی کا انمول نمونہ تھا۔ ان کی ہر تحریر میں انسان انسانیت اور مشرق و مشرقیت کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ ان کی کہانیاں بھی اسی کے وسیلے سے افراد اور اقدار کے باہمی روابطہ، مرد وزن کے نازک اور لطیف رشتوں پر داخلی اور خارجی عوامل کے اثرات ان کی نفسیاتی توجیہات اور معاشرتی ترجیہات اور ترجیہات کے مثبت یا منفی نتائج کے فطری یا غیر فطری اثرات کا فنکارانہ محاسبہ، محاکمہ یا تجزیہ پیش کرتی ہیں۔

صغرا مہدی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۶۹ میں کیا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''پتھر کا شہزادہ'' ۱۹۷۵ میں شائع ہوا۔ اس کے یکے بعد دیگرے ''جو میرے وہ راجا کے نہیں'' (۱۹۸۵)، ''پہچان'' (۱۹۹۵) اور ''پیش گوئی'' (۲۰۰۵) میں شائع ہوئے۔ افسانے کے علاوہ انہوں نے پانچ ناول پابہ جولاں'' (۱۹۷۲)، ''دھند'' (۱۹۷۴)، ''پروائی'' (۱۹۷۸)، ''راگ بھوپالی'' (۱۹۸۳) اور ''جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو'' (۱۹۹۰)، تین تنقیدی کتابیں (اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ (۱۹۸۱)، اکبر الہ آبادی (۱۹۸۳) اور اردو ناولوں میں عورت کی سماجی حیثیت (۲۰۰۲) اور بچوں کی تین کتابیں (بعنوان بچوں کے عابد حسین، بچوں کی صالحہ عابد حسین (۲۰۱۱)۔ اس کے علاوہ بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا۔ ان کا ہندی افسانوی مجموعہ ''گلابوں والا باغ'' شائع ہو کر ہندی ادبی حلقے میں داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ سفر نامہ سیر کر دنیا کی غافل (۱۹۹۴)، میخانوں کا پتہ (۲۰۰۵)۔ اس کے علاوہ ایک مزاحیہ مضامین کا مجموعہ بے خطر کود پڑے (۲۰۱۰) کتابیں قابل ذکر ہیں۔ ان کی آپ بیتی حکایت ہستی کے نام

سے(۲۰۰۶) میں شائع ہوئی۔صغریٰ مہدی نے پہلی کہانی بچوں کے رسالے ''کھلونے'' کے لئےلکھی جس کا عنوان ''ہمت کا پھل تھا'' اس وقت وہ آٹھویں جماعت کی طالبہ تھیں۔اس کے بعدان کی تخلیقات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا اور ''بیسویں صدی''، ''بانو''، ''آج کل'' اور ''سب ساتھیہ'' وغیرہ جیسے مشہور رسالوں میں ان کے افسانے متواتر شائع ہوئے۔

اپنے مطالعے کی جانچ

۱۔ صغرا مہدی کی آپ بیتی کا نام بتائیے۔

۲۔ پروائی اور دھند کیا ہیں؟

۳۔ صغرا مہدی کے سفرناموں کے نام لکھیے۔

۴۔ صغرا مہدی کی پہلی کہانی کا نام بتائیے۔

۵۔ صغرا مہدی کے تین افسانوں کے نام بتائیے۔

۶۔ صغرا مہدی کا صالحہ عابد حسین سے کیا رشتہ تھا؟

4.6 سیر کر دنیا کی غافل۔۔کے حوالے سے صغرا مہدی کے سفرنامہ نگاری کا جائزہ

صغرا مہدی نے مختلف شہروں اور ملکوں کا سفر کیا ہے۔اوراس سفر کی روداد انہوں نے اپنے سفرناموں میں بیان کی ہے۔اس سلسلے میں ان کے دوسفرنامے شائع ہوئے۔ایک ''میخانوں کا پتا'' اور دوسرا ''سیر کر دنیا کی غافل۔۔۔'' کے عنوان سے ہے۔سیر وسیاحت کے لئے وہ اتنی مشہور ہوئیں کہ پروفیسر مشیر الحسن نے انہیں ''ابنِ بطوطی'' کا خطاب دیا۔

صغرا مہدی کا سفرنامہ ''سیر کر دنیا کی غافل۔۔۔'' کتابی صورت میں پہلی بار ۱۹۹۴ میں منظرِ عام پر آیا۔اس سے پہلے اس سفرنامے کے کچھ حصے قسط وار ''کتاب نما'' میں شائع ہوئے تھے۔جیسے ''مشاہداتِ ابنِ بطوطی'' تین قسطوں میں شائع ہوا۔صغرا مہدی کا سفرنامہ ''سیر کر دنیا کی غافل۔۔۔'' پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ، بیرون ملک کا سفران کے خوابوں کی حقیقی تعبیر ہے۔سیر وسیاحت کی ہر زمانے میں اہمیت رہی ہے۔اور تا وقتیکہ کی جاری ہے۔ایک وہ زمانہ تھا کہ سفر کے لئے اتنی سہولیات میسر نہ تھیں۔اس کے باوجود لوگ سفر کی صعوبتیں اٹھا کر دور دراز کا سفر کرتے تھے۔اگر لوگوں نے یہ سفر نہ کئے ہوتے، تو دنیا کی تاریخ اتنی مبسوط نہیں لکھی جا سکتی تھی۔اور ہم بہت ساری چیزوں سے ناواقف ہی رہتے۔لوگوں نے سفر کر کے ہی نئی نئی چیزوں سے آگاہ کیا۔اوراسی توسط سے آنے والی نسلوں کے لئے بہت سا سرمایہ اکٹھا کیا۔لیکن جیسے جیسے زمانہ ترقی کرتا گیا، اس طرح کی چیزوں کی اہمیت پہلے کے مقابلے میں کم ہوتی گئی۔لیکن اس کی اہمیت سے یکسر انکار

ممکن نہیں۔اس سلسلے میں اگر ہم صغرا مہدی کا سفر نامہ''سیر کر دنیا کی غافل۔۔۔'' کو دیکھیں تو ہمیں بہت ساری چیزوں کی معلومات ہوتی ہے۔ویسے تو صغرا مہدی اردو کی معروف فکشن نگار ہیں۔لیکن انکی اور جو دوسری جہتیں ہیں، وہ بھی کچھ کم قابل توجہ نہیں۔ان کے یہاں جو طنز و مزاح کی چاشنی ملتی ہے، اسے''سیر کر دنیا کی غافل۔۔۔'' میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

صغرا مہدی کا سفر نامہ''سیر کر دنیا کی غافل۔۔۔'' کا تہذیبی حوالے سے مطالعہ کیا جائے تو اس لئے بھی زیادہ مناسب ہوگا کہ، جہاں انہوں نے بیرونِ ممالک کا ذکر کیا ہے، وہیں ہندوستان کا بھی ذکر کیا ہے۔اور موازنہ کرتے ہوئے کس طرح کا افسوس کیا ہے، اس کا اندازہ درج ذیل اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''ہمارے پیچھے ایک نوجوان خاتون کی باری تھی۔انہوں نے اطمینان سے بچے کو گود میں لیا اور پھر پریم کو فولڈ کیا اور پھر اطمینان سے بس میں چڑھیں اور پریم کو ایک کونے میں کھڑا کر کے بچے کو لے کر سیٹ پر بیٹھ گئیں۔میری نظروں میں کوئی اور ہی منظر گھوم رہا تھا۔دھکم دھکا، روتے، کچلتے بچے، بدتمیزیاں، بدزبانیاں کرتے کنڈکٹر ڈرائیور اور چلتی بسوں میں چڑھتے لوگ۔''(۴)

درج بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لندن اور ہندوستان کے (Bus Stop) اور اس کے بعد سوار ہونے کے مرحلے میں کس طرح کا فرق ہے۔جس خوبصورتی سے صغرا مہدی نے ہندوستان کی بسوں میں سوار ہوتے ہوئے لوگوں کا نقشہ کھینچا ہے، ایسا لگتا ہے کہ پورا منظر نظروں کے سامنے آ گیا ہے۔طنز و مزاح کی جو باتیں ان کے یہاں ملتی ہیں، وہ قابلِ توجہ ہیں اس لئے ہیں کہ ان میں بلا کی برجستگی ہے۔اور ایسا لگتا ہے کہ ایک دو جملے میں انہوں نے وہ ساری باتیں کہ دی ہیں، جس سے سامنے والا شخص سمجھنے کے ساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ہو جاتا ہے۔

''سیر کر دنیا کی غافل۔۔۔'' دراصل صغرا مہدی کے خوابوں کی تعبیر ہے۔انہوں نے ہندوستان کے بہت سے شہروں کا سفر کیا ہے۔اس سلسلے کا ایک حصہ اس کتاب میں''بچپن کی تلاش'' کے عنوان سے ہے۔جس میں انہوں نے بھوپال اور آس پاس کے حصوں کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔اس طرح کے اندرون ملک کے سفر سے دوسرے ممالک کی سیر کرنے کا شوق پیدا ہوا۔لیکن 1980 کے آس پاس عام طور سے صرف سیر و تفریح کی غرض سے کم ہی لوگ ایسے تھے، جو اپنے شوق کے پیچھے اس طرح سے قرض لے کر سفر کرتے تھے۔چونکہ وسائل بہت محدود ہوتے تھے۔اور آمدنی اتنی نہیں ہوتی تھی کہ کہیں سیر و تفریح کے لئے جایا جا سکے۔لیکن صغرا مہدی انہی چند لوگوں میں سے تھیں، جنہوں نے اپنے شوق کے لئے لوگوں سے قرض لیا۔اور سب سے پہلے انہوں نے لندن کا سفر کیا۔دراصل یہ سفر لندن کے ساتھ ساتھ دوسرے ملکوں کا بھی تھا۔لیکن ان سب کا ذکر ضمناً کیا گیا ہے۔اپنے لندن کے سفر کے متعلق لکھتی ہیں:

''ٹکٹ تو آ گیا مگر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ایک پیسا نہیں تھا۔اس کے لئے عزیزوں، دوستوں نے چندہ کر کے تین ہزار روپے کا انتظام کیا۔اسٹیٹ بینک سے فارن ایکسچینج میں گیا۔دوسو پچانوے پونڈ اور وہاں ستر ڈالر اور بھی ملیں گے۔اس کے لیے پھر چندہ۔سولہ کو کرنل زید یکے گھر ہمارا رخصتی لنچ اور لنچ کے دوران ان کے سفر کے دلچسپ قصے۔اور اس سفر پر اظہار خوشی ومسرت۔اسی دن برصغیر کی مشہور ادیبہ قرۃ العین حیدر بھی علی گڑھ سے دہلی آئیں اور بر بنائے وضع داری ہم سے ملنے ہمارے گھر آئیں تو ہم نے فرض کر لیا کہ وہ خاص طور سے ہمیں رخصت کرنے علی گڑھ سے آئی ہیں۔ایسی باتیں فرض کرنے میں کیا حرج ہے؟'' ۔(۵)

درج بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس حالت میں جب کہ ان کے پاس سب سے بڑا وسیلہ پیسہ نہ ہوتے ہوئے بھی ان کا حوصلہ مدھم نہیں پڑا۔دوستوں سے قرض لیکر اپنا یہ شوق پورا کرنے کے لئے سامان سفر بھی تیار کر لیا،اور لندن کے لئے نکل پڑیں۔چونکہ صغرا مہدی ایک فکشن نگار تھیں اس لئے انہوں نے اپنی تیسری آنکھ سے وہاں کے سماج کو دیکھا۔حقیقت یہ ہے کہ لندن میں بھی انہیں ہندوستان ہی دکھتا تھا۔لیکن وہاں اور ہندوستان کے بیچ جو فرق ہے اسے بڑے درد سے بیان کیا ہے۔ان کا یہ سفر کل تین ہفتے پر مشتمل تھا۔غرض کہ اپنے اس شوق کی تکمیل کے لئے انہیں قرض تک لینا پڑا۔اور قربان جایئے اس شوق پر کہ قرض کی ادائیگی کے بعد دوبارہ سفر کا ارادہ بھی کر لیا۔ان کے سفر کے متعلق پروفیسر خالد محمود نے لکھا ہے:

''صغرا مہدی کا کمال یہ ہے کہ وہ کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ گھومنے پھرنے اور ہر چیز کو بغور دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔یہ خوبی ان میں اس لئے پیدا ہوئی کہ وہ ایک حقیقی سیاح کی مانند سفر ہی کو اپنا مقصد اور منزل بنا کر گھر سے نکلی ہیں۔۔۔سفر ہی ان کا مقصود سفر ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ سفر میں اس قدر محو ہو جاتی ہیں کہ انہیں کھانے پینے اور آرام کرنے کا ہوش بھی نہیں رہتا۔سفر نامہ لکھتے وقت سفر کی یہی محویت اسلوب کی راہ سے ان کی تحریر میں اتر آتی ہی اور تحریر کے وسیلے سے قاری پر طاری ہو جاتی ہے۔محویت کا سفر ہی دراصل سفر کے مقصود سفر ہونے کی دلیل ہے۔''(۶)

صغرا مہدی نے اپنی پوری زندگی اردو زبان و ادب کی خدمت کی نذر کر دیا۔انہوں نے واقعات کو جس طرح سے بیان کیا ہے، وہ ان کا اپنا خاص انداز تھا۔یہی انفرادیت صغرا مہدی کی اپنی پہچان ہے۔ایک ہی جملے میں قاری کو بہت

ساری چیزوں کی طرف اشارہ کرا دیتی ہیں۔اوراسی جملے میں چھپا ان کا طنز بھی دیکھا جا سکتا ہے۔اوراس طرح کے بے شمار واقعات اس سفرنامے میں بیان کیے گئے ہیں۔اب وہ ہمارے درمیان نہیں رہیں،لیکن انکے یہ ادبی کارنامے آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ بنیں گے۔

4.7 خلاصہ

صغریٰ مہدی اگست 1938ء کی آٹھویں تاریخ کو بھوپال میں پیدا ہوئیں۔تعلیم دلی اور علی گڑھ میں ہوئی۔ ڈاکٹریٹ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے حاصل کی۔انہوں نے کہانیاں اور ناول لکھے،سفرنامے تحریر کیے،ادبی تنقید کی کئی کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔انہوں نے جید عالم ڈاکٹر عابد حسین اور ان کی افسانہ نگار، ناول نگار اور تحقیقی مضامین لکھنے والی شریکِ حیات صالحہ عابد حسین کے ساتھ زندگی گزاری اور گھر کے علمی،ادبی اور تہذیبی ماحول نے ان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔1973ء میں ان کا پہلا ناول ''پابہ جولاں'' اور 1975ء میں کہانیوں کا پہلا مجموعہ ''پتھر کا شہزادہ'' شائع ہوا۔''جو میرے وہ راجا کے نہیں'' اور ''جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو' ان کے وہ افسانوی مجموعے ہیں جو بے حد مقبول ہوئے۔ادب میں عورت کی حیثیت اور ہندوستانی سماج میں مسلمان عورت کا مقام ان کی دل چسپی کے خاص موضوعات تھے۔''دوردرشن'' کے لیے انہوں نے دو ٹی وی سیریل لکھے،جن میں سے ایک ''راگ بھوپالی'' اور دوسرا صالحہ عابد حسین کے ناول ''ساتواں آنگن'' کی ڈرامائی تشکیل تھی۔

وہ ایک دوست دار اور دل دار شخصیت تھیں۔پاکستانی ادیبوں کی وہ جس گرم جوشی سے مہمان داری کرتیں،وہ لوگوں کو تادیر یاد رہتی۔قرۃ العین حیدر سے ان کی گہری قربت تھی۔عینی آپا نے انہیں ''مشیر خاص'' کے عہدے پر فائز کر رکھا تھا اوراسی لیے وہ کبھی کبھی انہیں ''مشیر فاطمہ'' کے نام سے بھی یاد کرتیں۔صغریٰ مہدی جدید اردو افسانے کا ایک اہم نام تھیں۔شہروں شہروں ملکوں ملکوں بلائی جاتیں اور ہر جگہ لوگ ان کے لیے آنکھیں بچھاتے۔وہ رونقِ بزمِ جہاں تھیں۔ان کے دم سے ادب کی دنیا اور دوستوں کی محفل میں اجالا تھا۔یہ اجالا ہمارے درمیان سے 17 مارچ 2014ء کو اٹھا لیا گیا۔

صغریٰ مہدی اردو کی خواتین فکشن نگاروں میں ایک ممتاز حیثیت کی مالک تھیں اوران کو یہ دولت ایک طرح سے وراثت میں ملی تھی۔وہ اردو ادب کی استاد تھیں اوراس کے ساتھ ساتھ ایک تخلیقی نثر نگار بھی اوران کا خاص میدان فکشن تھا۔ان کے تخلیق کردہ افسانوں اور ناولوں میں اعلا انسانی اقدار کا احترام اور سماجی اصلاح کا مثبت تعمیری جذبہ ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔انھوں نے سفرنامے، یادداشتیں بھی لکھیں۔وہ جامعہ میں تمام عمر رہیں،یہیں طالبِ علم رہیں اور یہیں پروفیسر ہوئیں۔ان کا خاندان علم وادب کا گہوارہ تھا اوراس روایت کی انھوں نے پاسداری کی۔

4.8 نمونۂ امتحانی سوالات

(الف) درج ذیل سوالوں کے جواب تیس تیس سطروں میں لکھیے۔

۱۔ صغرا مہدی کی ادبی خدمات کا جایزہ پیش کیجئے۔

۲۔ صغرا مہدی کی شخصیت پر روشنی ڈالیے۔

۳۔ سفرنامہ سیر کر دنیا کی غافل۔۔۔کا اپنے الفاظ میں جائزہ پیش کیجئے۔

(ب) درج ذیل سوالوں کے جواب پندرہ پندرہ سطروں میں لکھیے۔

۱۔ صغرا مہدی کا فکشن نگاری کے حوالے سے جائزہ پیش کیجئے۔

۲۔ صغرا مہدی کے ناولوں اوران کی تنقیدی کتابوں کے نام لکھیے۔

(ج) درج ذیل عبارات کی سیاق وسباق کے حوالے سے وضاحت کیجیے۔

۱۔ شاہدہ نے موقع کو بھانپ لیا اور انھوں نے اونچے سروں میں ہندوستان کی تعریف شروع کر دی اور کہا بھائی ہمارا اور آپ کا کیا مقابلہ!

۲۔ وہ جب بھی یہاں آتے تو گھبرائے گھبرائے رہتے کہ ہندوستان کے مخالف کوئی بات ان کے منہ سے نہ نکل جائے۔مگر چھوٹے بچے اپنے پر اس حد تک قابو نہ رکھ پاتے اور ہندوستان کے خلاف کچھ نہ کچھ کہہ جاتے۔

4.9 فرہنگ

ادبا	ادیب کی جمع
قلانچے	چھلانگ، جست
شغف	بے حد محبت
مراسم	میل جول

4.10 معاون کتابیں

صغرا مہدی	حکایت ہستی
صغرا مہدی	سیر کر دنیا کی غافل
خالد محمود	صغرا مہدی کا افسانہ: دوسرا ہنی مون (مضمون)
نگار عظیم	ایک باغ و بہار شخصیت: صغرا مہدی (مضمون)
ڈاکٹر شاہ نواز فیاض	خوابوں کی تعمیر: سیر کر دنیا کی غافل ۔۔۔۔ (مضمون)

4.11 حواشی

(۱) حکایت ہستی، صغرا مہدی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

(۲) حکایت ہستی، صغرا مہدی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

(۳) حکایت ہستی، صغرا مہدی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

(۴) سیر کر دنیا کی غافل ۔۔۔، صغرا مہدی ۔ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ ۔ دسمبر ۱۹۹۴ ۔ ص ۔ ۲۰

(۵) سیر کر دنیا کی غافل ۔۔۔، صغرا مہدی ۔ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ ۔ دسمبر ۱۹۹۴ ۔ ص ۔ ۱۲

(۶) سیر کر دنیا کی غافل ۔۔۔، صغرا مہدی ۔ مکتبہ جامعہ لمٹیڈ ۔ دسمبر ۱۹۹۴ ۔ ص ۔ ۳

☆☆☆

munotes.in

نصاب

(حصہ دوم)

(۱) مجتبیٰ حسین

۱۔ جاپان چلو، جاپان چلو

۲۔ جاپان میں اردو

۳۔ بلٹ ٹرین میں کبھی نہ بیٹھو

۴۔ ٹوکیو کے بازار میں

(۲) صغرا مہدی

۱۔ ذرا یہیں پڑوس میں

۲۔ چلتے ہو تو ماریشس چلیے

munotes.in

مجتبیٰ حسین

جاپان چلو۔جاپان چلو

جولائی ۱۹۸۰ء کے مہینے کی بات ہے۔ایک دن ہم حسبِ معمول دیر سے دفتر پہنچے تو پتہ چلا کہ خلافِ معمول ہمارے افسر بالا نے ہمیں یاد کیا ہے۔ہم ہانپتے کانپتے اُن کی خدمت میں پہنچے تو فرمایا ''ہم تمہیں جاپان بھیجنا چاہتے ہیں۔کیا تم جانے کے لئے تیار ہو؟''

ہم نے کہا ''سر!ہم جانتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں جب کسی شخص سے کوئی جُرم سرزد ہو جاتا تو اسے سزا کے طور پر ملک بدر کر دیا جاتا تھا۔مانا کہ ہم دفتر دیر سے آتے ہیں لیکن یہ اتنا بڑا جُرم تو نہیں کہ آپ ہمیں جاپان بھیج دیں۔پھر جاپان سے ہم بیسیوں چیزیں درآمد کرتے ہیں۔کیا اس ملک سے جاپان کو برآمد کرنے کے لئے ہم ہی ایک مناسب چیز رہ گئے ہیں؟''

بولے ''تم ہر بات میں سے مزاح کا پہلو نکال لیتے ہو۔ہم تمہیں سچ مچ جاپان بھیجنا چاہتے ہیں۔جاپان کے بارے میں کچھ جانتے بھی ہو؟''

ہم نے کہا ''سر!ہائی اسکول تک جغرافیہ پڑھی تھی۔اس وقت تک تو جاپان براعظم ایشیاء میں ہی تھا۔اب بھی شاید ایشیا میں ہی ہوگا۔ہم ٹھیک سے کہہ نہیں سکتے کیونکہ سنا ہے کہ جاپان نے بہت ترقی کر لی ہے اور ترقی یافتہ ملکوں کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب کدھر کو نکل جائیں۔یوں بھی براعظم ایشیا ہم جیسے ملنگوں کی سرزمین ہے جہاں پیٹ کی اہمیت کم اور روح کی زیادہ ہے۔ہمیں تو غریبی میں نام پیدا کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ایسے براعظم میں جاپان کا کیا کام؟ اگر ہم سے جاپان کے بارے میں مزید کچھ پوچھیں تو اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم بہت چھوٹے تھے اور دوسری جنگ عظیم اپنے عروج پر تھی تو یوں لگتا تھا جیسے جاپان ہمارے گھر کے پچھواڑے میں واقع ہے۔ہمیں ہر دم یہ بتایا جاتا تھا کہ جاپانی اب آنے ہی والے ہیں۔جنگ ختم ہوگئی اور جاپان پھر اپنی جغرافیائی حدود میں واپس چلا گیا۔جاپان کے بارے میں ہماری جھولی میں بس اتنی ہی معلومات ہیں۔''

بولے ''جاپان کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟۔''

ہم نے دماغ پر قدرے زور دے کر کہا ''ہاں!خوب یاد آیا۔جاپان کی گُڑیاں بہت مشہور ہیں۔''

بولے ''بس اتنا کافی ہے۔جاپان کے بارے میں تم تو بہت کچھ جانتے ہو۔ہم جاپان کے دورے کے لئے تمہارا نام مرکزی وزارتِ تعلیم کو بھیج رہے ہیں۔''

munotes.in

ہم نے کہا ’’سر! آخر ماجرا کیا ہے۔ صاف صاف بتائیے کہ آپ چاہتے کیا ہے۔‘‘

بولے ’’ٹوکیو میں یونیسکو کے ایشیائی ثقافتی مرکز کی طرف سے پبلشنگ کا ایک ترتیبی کورس اکتوبر میں منعقد ہو رہا ہے۔ اس کے لئے ہندوستان سے ایک عہدہ دار کو روانہ کرنا ہے اور مرکزی وزارت تعلیم نے مختلف محکموں سے عہدہ داروں کے نام مانگے ہیں۔ ہم اپنے ادارے سے تمہارا نام بھیج رہے ہیں۔ کیا پتہ کہ مرکزی وزارتِ تعلیم اس کورس کے لئے تمہارا انتخاب کرلے۔ کبھی کبھی انتخاب میں غلطی بھی تو ہو جاتی ہے۔‘‘

ہم نے اس ذرّہ نوازی کا شکریہ ادا کیا اور اُٹھ کر جانے لگے تو ہمارے افسر بالا نے پوچھا ’’اس سے پہلے کبھی ہندوستان سے باہر گئے ہو؟‘‘

ہم نے کہا ’’سر! جی تو ہمارا بھی بہت چاہتا ہے کہ نئی نئی زمینیں دیکھیں، نئے نئے آسمانوں میں جھانک آئیں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پئیں، نئے لوگوں سے نئی نئی باتیں کریں، نئے چہروں کو نئے ڈھنگ سے دیکھیں، مگر ہمارا جذبۂ حُب الوطنی ہمیں باہر جانے نہیں دیتا۔ ہمیں ہر دم یہ فکر رہتی ہے کہ اگر ہم باہر چلے گئے تو پھر ملک کا کیا ہوگا۔ ہمارے بغیر آخر ملک کس طرح ترقی کر سکتا ہے۔ پھر ہم نے کچھ ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو دس دن کے لئے ہی سہی باہر کے کسی ملک میں جا کر آتے ہیں تو زندگی بھر اس ملک کے قصّے اور وہ بھی من گھڑت قصّے سنا کر اپنا اور اہل وطن کا وقت برباد کرتے ہیں۔ انہیں اپنے ملک کا سورج اچھا نہیں لگتا۔ چاند کی طرف دیکھتے ہیں تو منہ موڑ کر کہتے ہیں ’’برطانیہ میں جو چاند ہم نے دیکھا تھا وہ چاند بھلا اس ملک میں کہاں نظر آئے گا۔ بھلا یہ بھی کوئی چاند ہے۔‘‘ غرض انہیں اپنے ملک کی کوئی چیز اچھی نہیں لگتی۔ خدانخواستہ جاپان کے دورے کے لیے ہمارا انتخاب ہو گیا تو واپس آ کر اپنے ملک میں بقیہ زندگی کس طرح گزاریں گے۔ ہمارے افسر بالا نے کہا ’’ہم تمہارے جذبۂ حب الوطنی کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ تبھی تو تمہارا نام اس دورے کے لئے تجویز کر رہے ہیں۔ رہی یہ بات کہ تم باہر چلے گئے تو اس ملک کا کیا ہوگا، اس سلسلے میں ہمارا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں تمہارا باہر جانا نہایت ضروری ہے تاکہ ہمیشہ کے لئے تمہاری خوش فہمی دور ہو سکے۔‘‘

اس بات چیت کے بعد ایک مہینہ بڑی خاموشی کے ساتھ گزر گیا۔ ایک دن دفتر میں بیٹھے کام کر رہے تھے کہ ایک دوست نے آ کر چپکے سے کہا ’’اگر تم جاپان سے میرے لئے ایک بڑھیا ٹرانزسٹر لا سکو تو تمہیں ایک خوشخبری سنانی ہے۔‘‘

ہم نے کہا ’’ضرور سناؤ۔‘‘

بولے ’’پہلے ٹرانزسٹر لانے کا وعدہ کرو پھر سناتا ہوں۔‘‘ ہم نے وعدہ کرلیا تو موصوف نے پہلے تو وہ کاغذ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا جس میں ٹرانزسٹر کی تفصیلات لکھی ہوئی تھیں۔ پھر فرمایا ’’یار! ابھی ابھی مرکزی وزارت تعلیم سے اطلاع آئی ہے کہ جاپان کے دورے کے لئے تمہارا انتخاب ہو گیا ہے۔ اب تو تمہیں میرے لئے ٹرانزسٹر لانا ہی ہوگا۔ یونیسکو کے

مہمان ہو کوئی مذاق نہیں ہے۔ ۳۵ دنوں تک روزانہ دس ہزار ین (جاپانی سکہ) ملا کریں گے۔ میرا ٹرانزسٹر تو صرف تین ہزار ین میں آ جائے گا۔'' یہ پہلی فرمائش تھی۔ اس کے بعد جوں جوں ہمارے دورۂ جاپان کی اطلاع ہمارے دشمنوں میں پھیلی لوگ فرمائشوں کی فہرست دینے کے بعد مبارکباد بعد میں دیتے تھے۔ کچھ ستم ظریف ایسے بھی تھے جو فرمائشوں کی فہرست دینے کے بعد مبارکباد دینا بھول جاتے تھے اور ہمیں مجبوراً انہیں یاد دلانا پڑتا تھا کہ وہ ایک خوشگوار فریضہ انجام دینا بھول گئے ہیں۔ ہمیں بیس دن بعد جاپان میں قدم رنجہ فرمانا تھا اور اس مقصد کے لئے دوستوں سے سامان سفر مانگنا تھا۔ چونکہ ہم سرکاری حیثیت میں باہر جا رہے تھے اس لئے سفر کے دوسرے مرحلے تو فوراً طے ہو گئے لیکن فرمائشوں کا سلسلہ دن بہ دن دراز ہوتا چلا گیا۔ جاپان روانہ ہونے سے ایک دن پہلے ہم نے بڑی محنت سے دوستوں کی فرمائشوں کی فہرست مرتب کی تو پتہ چلا کہ حسب ذیل سامان جاپان سے ہمیں ہر حالت میں لانا ہے۔

ٹرانزسٹر دستی ۱۵ عدد۔ ٹرانزسٹر مع ٹیپ ریکارڈ۔ ۱۔ عدد۔ شفان کی ساڑیاں ۴۵ عدد، کیلکیو لیٹر ۲۵ عدد، سیکو گھڑیاں خواتین کی ۱۰ عدد، مردوں کی ۱۵ عدد، ٹیلی ویژن کے چھوٹے سیٹ ۴ عدد، ٹی سیٹ ۴ عدد، ٹیپ ریکارڈ کے کیسٹ ۱۰۰ عدد، جاپان کی چھتریاں ۲۰ عدد، جاپانی موزے ۷۵ عدد، متفرق سامان ۱۰۰ عدد، جاپان کی گڑیاں ۲ عدد (ایک گڑیا ہمارے دوست اور کرم فرما جناب پی گنگا ریڈی وزیر سیول سپلائز آندھرا پردیش کے لئے اور دوسری گڑیا ہمارے دوست قاضی سلیم کی لڑکی سلمیٰ کے لئے) جاپان کی گڑیوں کی فرمائش اب بھی ہمارے لئے ایک معمّہ بنی ہوئی ہے۔ ہمارے کرم فرما جناب پی گنگا ریڈی، ہمارے جاپان روانہ ہونے سے پہلے دہلی آئے تو کہنے لگے ''مجتبیٰ بھائی! آپ جاپان جا رہے ہیں۔ میری ایک چھوٹی سی فرمائش ہے۔ کیا آپ پوری کر سکیں گے؟''

ہم نے کہا ''آپ کے لئے تو ہم پورے جاپان کو اُٹھا کر لا سکتے ہیں۔ یوں بھی ہم ایروں غیروں کے لئے پندرہ بیس ٹرانزسٹرز، تیس گھڑیاں، چالیس پچاس ساڑیاں اور نہ جانے کیا کیا جاپان سے لا رہے ہیں۔ آپ تو ہمارے عزیز ترین دوست اور کرم فرما ہیں۔ آپ فرمائش کر کے تو دیکھئے۔'' یہ سن کر ہمیں ایک کونے میں لے گئے اور آہستہ سے کان میں کہا ''میرے لئے ایک اچھی سی جاپانی گُڑیا لے آیئے۔''

ہم نے کہا ''یہ کون سی مشکل بات ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ آج ہی قاضی سلیم کی بیٹی نے بھی ہم سے ایک جاپانی گُڑیا کی فرمائش کی ہے۔ جب ہم اس کے لئے ایک گڑیا خریدیں گے تو آپ کے لئے بھی ایک اور خرید لیں گے۔ بھلا یہ بات بھی کونے میں الگ لے جا کر کہنے کی ہی؟''

گنگا ریڈی صاب بولے ''مجتبیٰ بھائی! آپ کیسے مزاح نگار ہیں۔ میری جاپانی گڑیا اور قاضی سلیم کی بیٹی کی گڑیا میں کوئی فرق محسوس نہیں کر سکتے۔ خیر آپ کی مرضی۔''

munotes.in

اب جب کہ ہم جاپان پہنچ گئے ہیں۔ ان کی بات اب بھی ہمارے لئے معمہ بنی ہوئی ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو ہم نے ٹھان لیا ہے کہ ان کے لئے اور قاضی سلیم کی بیٹی کے لئے دو عدد جاپانی گڑیاں ضرور لیتے آئیں گے کیونکہ یہاں آنے کے بعد ہم نے فرمائشوں کی فہرست کا جاپان کی مہنگائی کے پس منظر میں ٹھنڈے دل و دماغ سے جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ ہم اس فہرست میں سے صرف دو گُڑیاں ہی خرید سکتے ہیں۔

ہندوستان سے روانہ ہونے سے ایک دن پہلے جب ہم اپنے گھر میں فرمائشوں کی فہرست مرتب کر رہے تھے تو ہماری اہلیہ محترمہ نے اس فہرست کو دیکھ کر سوچا کہ لگے ہاتھوں فرمائشوں کی اپنی فہرست بھی ہمیں تھما دیں۔ ہم نے اس فہرست کا ہوائی جہاز میں بغور مطالعہ کیا۔ خاصی دلچسپ فہرست ہے اور اس کے مطالعہ سے ہمارا سفر خاصا آرام سے کٹا۔ اس لئے کہ اس فہرست میں کہیں ٹرانزسٹر ہے نہ ساڑی، نہ ٹیلی ویژن ہے نہ جاپانی چھتری ہے۔ بس ہم سے اتنی معصوم سی خواہش کی گئی ہے کہ ہم جاپان سے ۵۰ کلوگرام گیہوں، ۴۰ کلوگرام چاول، مونگ پھلی کا تیل چھ کیلوگرام، نہانے کا صابن چھ ٹکیاں، کپڑے دھونے کا صابن آٹھ ٹکیاں لے آئیں۔ الغرض یہ فہرست ہوتے ہواتے سوگرام لونگ، سوگرام الائچی اور سو گرام شاہ زیرے پر ختم ہوگئی ہے۔ البتہ جاپان پہنچنے کے بعد ہماری اہلیہ محترمہ نے فون پر اطلاع دی ہے کہ غلطی سے مہینے بھر کے سامان کی فہرست ہمارے ساتھ چلی گئی ہے اور جو چیزیں جاپان سے آنی ہیں ان کی فہرست بذریعہ ڈاک روانہ کی جارہی ہے۔ اب جگر تھام کے بیٹھو میری باری آئی۔ اور ہاں! ہمیں اپنے ایک ادیب دوست کی معصوم سی فرمائش بھی یاد آگئی۔ انہیں جب پتا چلا کہ ہم جاپان جارہے ہیں تو ہم سے کہا ''تم جاپان جارہے ہو تو ایک چھوٹی سی فرمائش ہے۔''

ہم نے کہا ''ارشاد ہو''

بولے ''جاپان جانے سے پہلے یہ وعدہ کرتے جاو کہ تم جاپان کے بارے میں کوئی سفر نامہ نہیں لکھو گے۔''

ہم نے ان کی فرمائش کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا مگر جب ہم اپنے اتنے سارے دوستوں اور بہی خواہوں کی فرمائشوں کی تکمیل نہیں کر پارہے ہیں تو ان کی فرمائش کے بارے میں کیوں سنجیدہ ہو جائیں۔ لگے ہاتھوں ایک مصرعہ یاد آگیا۔ غالباً پنڈت ہری چند اختر کا ہے۔ یہاں جاپان میں کوئی اُردو کتاب بھی تو نہیں ملتی کہ جس شاعر کا صحیح نام معلوم کرنے کے لئے حوالے کے طور پر استعمال کرسکیں۔ مصرعہ کچھ یوں ہے:

ے کہا جاپان کا ڈر ہے کہا جاپان تو ہوگا

اردو میں جاپان کے بارے میں غالباً یہ پہلا اور واحد مصرعہ ہے اور انشاء اللہ ہمارا سفر نامہ بھی اُردو میں جاپان کے بارے میں اپنی نوعیت کا پہلا سفر نامہ ہوگا۔

☆☆☆

munotes.in

جاپان میں اُردو

صاحبو! ان دنوں ہندوستان کے سوائے ہر جگہ اردو کی تلاش جاری ہے۔ امریکہ میں اُردو، برطانیہ میں اُردو، خلیجی ممالک میں اُردو، سنگاپور میں اُردو اور رنگون میں اُردو جیسے مضامین تو آپ نے پڑھے ہونگے۔ ابھی حال ہی میں ایک صاحب نے نائجیریا تک میں اُردو کی تلاش کی ہے۔ ان حالات میں یہ ناممکن تھا کہ ہم جاپان جاتے اور وہاں اُردو کو تلاش نہ کرتے۔ بفضل تعالیٰ جاپان میں تو اچھی خاصی اُردو موجود ہے بلکہ اتنی اُردو موجود ہے کہ ہمیں وہاں اُردو کو تلاش کرنا نہیں پڑا بلکہ اُردو نے خود ہمیں تلاش کرلیا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب جاپانی اُردو کے کرتا دھرتاؤں کو پتہ چلا کہ ہم جاپان آئے ہوئے ہیں تو انہوں نے ہمارے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک اُردو والا دوسرے اُردو والے کے ساتھ کرتا ہے یعنی فوراً ہمارے خیر مقدمی جلسہ کا اہتمام ہوگیا۔ اس کے ذمہ دار ہمارے دوست سوزوکی تاکیشی تھے جو ٹوکیو یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات میں اُردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔ اُردو ماحول اور اُردو تہذیب میں اس قدر ڈوبے ہوئے ہیں کہ انہیں دیکھ کر حسرت ہوتی ہے کہ اے کاش ہم بھی اُردو کے لئے اتنا کچھ کر سکتے۔ ابھی حال میں انہوں نے اوساکا یونیورسٹی برائے بیرونی مطالعات کے اُردو استاد پروفیسر اسادہ کے اشتراک سے ایک جاپانی اُردو لغت مرتب کی ہے۔ پروفیسر سوزکی اپنی یونیورسٹی میں فوراً ہمارا خیر مقدم کرنا چاہتے تھے لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ اُردو کے ہر اچھے اور سچے کام میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ سو جاپان میں بھی یہی ہوا۔ یونیسکو والوں نے ہمارا پروگرام اتنا کسا ہوا بنایا تھا کہ جاپان پہنچنے کے تیرہ دن بعد بھی ہم اپنا خیر مقدم نہ کروا سکے۔ عجیب بے چینی کا عالم تھا۔ ہم نے یونیسکو والوں سے گڑگڑا کر کہا کہ خدارا ہماری ایک دوپہر خالی رکھی جائے تاکہ یونیورسٹی میں اپنا خیر مقدم کروا آئیں۔ یوں بھی آج تک کسی یونیورسٹی میں ہمارا خیر مقدم نہیں ہوا ہے۔ اب جاپانیوں کی غفلت سے ایک موقع ہاتھ آیا ہے تو اس میں یونیسکو اپنی ٹانگ اڑا رہا ہے۔ کہنے کو رہ جائے گا کہ کسی یونیورسٹی میں کبھی ہمارا ابھی خیر مقدم ہوا تھا ورنہ یونیورسٹیوں سے ہمارا کیا تعلق۔ جب یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو تب بھی یونیورسٹی سے بے تعلق اور بے نیاز سے رہتے تھے۔ ہماری لگاتار عاجزیوں نے بالآخر یونیسکو کے عہدہ داروں کے دل میں ہمارے لئے رحم کا جذبہ پیدا کر دیا اور ایک دن ہم سچ مچ اپنا خیر مقدم کروانے کے لئے ٹوکیو یونیورسٹی کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ پروفیسر سوزوکی نے کہہ رکھا تھا کہ ہم ٹھیک دو بجے شعبے اُردو میں پہنچ جائیں۔ مگر اپنا خیر

مقدم کروانے کی ہمیں کچھ اتنی جلدی تھی کہ ڈیڑھ بجے ہی یونیورسٹی کے سینہ پر مونگ دلنے کے لئے جا پہنچے۔تھوڑی دیر کے لئے احساس بھی ہوا کہ جاپانی وقت کے پابند ہوتے ہیں۔کوئی کام وقت سے پہلے یا وقت کے بعد نہیں کرتے۔اگر ہم آدھا گھنٹہ پہلے پہنچ گئے تو ہمارا خیر مقدم مقررہ وقت سے پہلے نہیں کریں گے۔بہر حال پروفیسر سوزکی کے کمرے کے باہر ایک بورڈ پر فارسی رسم الخط میں لکھا تھا''خوش آمدید مجتبیٰ حسین''ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ تین چار جاپانی لڑکیاں اپنے سامنے اُردو کی کتابیں پھیلائے بیٹھی ہیں۔ہمیں دیکھتے ہی ان لڑکیوں نے کہا''السلام علیکم۔''ہم نے وعلیکم السلام کے بعد انگریزی میں پوچھا کہ پروفیسر سوزوکی کہاں ہیں تو ایک لڑکی نے نہایت سلیس اُردو میں کہا''وہ تو دو بجے ہی یہاں آئیں گے کیوں کہ آپ کا استقبال تو دو بجے ہونا ہے۔پروفیسر سوزوکی ایم۔اے کی کلاس لینے گئے ہیں''۔ہم پر دو باتوں کی وجہ سے گھڑوں پانی پڑ گیا۔اول تو وقت سے پہلے پہنچنے پر اور دوسرے یہ کہ جب جاپانی لڑکیاں اُردو بول رہی ہیں تو ہم نے کیوں خواہ مخواہ اپنی انگریزی دانی کا مظاہرہ کیا۔ہم نے ان لڑکیوں سے پوچھا''آپ آردو پڑھتی ہیں۔؟''ایک طالبہ مسز شاشورے نے بتایا کہ وہ ٹوکیو یونیورسٹی سے اُردو میں ایم۔اے کر رہی ہیں اور ماشاءاللہ عصمت چغتائی کی افسانہ نگاری پر مقالہ لکھ رہی ہیں۔عصمت چغتائی کی ساری کتابیں موصوفہ کے سامنے تھیں۔بعض کتابیں ایسی بھی تھیں جن کا دیدار خود ہم نے کبھی نہیں کیا تھا۔ایک اور بی بی تاکاناشے کے سامنے کرشن چندر کی کتابیں''شکست''،''پودے''اور''جب کھیت جاگے''رکھی تھیں۔ہم خط کا مضمون لفافہ دیکھ کر بھانپ لیتے ہیں۔چنانچہ ہم نے پوچھا''اور بی بی آپ غالباً کرشن چندر پر ریسرچ کر رہی ہیں؟''اثبات میں سر ہلا کر بولیں''کرشن چندر میرے پسندیدہ ادیب ہیں۔کیا آپ کی کبھی کرشن چندر سے ملاقات ہو چکی ہے۔''

ہم نے ڈینگ ہانکنے کے انداز میں کہا''بی بی!اگر کرشن چندر آپ کے محبوب ادیب ہیں تو ہم نہ صرف کرشن چندر کے بلکہ عصمت چغتائی کے بھی محبوب ادیب رہ چکے ہیں۔''

ہماری بات کو سن کر دونوں طالبات کے منہ حیرت سے کُھل گئے۔بولیں''کیا سچ مچ آپ کرشن چندر اور عصمت چغتائی سے مل چکے ہیں۔یہ تو بڑی عظیم ہستیاں ہیں۔''

بعد میں پانچ سات منٹ تک ہم نے ان طالبات کو اُردو ادب میں اپنے صحیح مقام سے آگاہ کیا۔اُردو ادب کے لئے اپنی گرانقدر خدمات ان کے گوش گزار کیں۔یہ بھی کہا کہ ہم بھی کچھ کم عظیم ہستی نہیں ہیں۔

مسز شاشورے بولیں''اگر آپ عصمت چغتائی کو سچ مچ جانتے ہیں تو میرا ایک کام کر دیجئے۔مجھے ان کی کتاب''دھانی بانکیں''نہیں مل رہی ہے۔کیا آپ ان سے کہہ کر یہ کتاب میرے لئے بھجوادیں گے۔''

ہم نے جھوٹ موٹ کہا۔''آپ اطمینان رکھیں۔ہندوستان جانے کے بعد ہم عصمت چغتائی کو اس سلسلہ میں

munotes.in

بتائیں گیاورآپ کو یہ کتاب مل جائے گی۔'' مسز شاشورے نے پوچھا'' آپ ہندوستان کے کس علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں؟'' ہم نے کہا'' بی بی! ویسے تو ہم ان دنوں دہلی میں رہتے ہیں لیکن اصل میں ہمارا تعلق حیدرآباد سے ہے۔کبھی آپ نے نام سنا ہے؟''

بولیں'' حیدرآباد تو میرا محبوب شہر ہے۔میں وہاں جا چکی ہوں۔چار مینار کا شہر۔معصوم سیدھے سادے اورخوش اخلاق لوگوں کا شہر۔''

ہم نے کہا'' اتنی کم عمری میں آپ حیدرآباد جانے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟''

بولیں'' جاپان کی یونیورسٹیاں اپنے طلباء کو اُس علاقہ اور ماحول میں ضرور بھیجتی ہیں جس علاقہ اور ماحول کی یہ زبان سیکھ رہے ہوتے ہیں۔''

بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ ٹوکیو یونیورسٹی کے اُردو پڑھنے والے سارے طلباء ہندوستان اور پاکستان کے کئی شہروں کا دورہ کر چکے ہیں۔

مسز شاشورے نے ہم سے پوچھا'' کیا آپ کبھی حیدرآباد جاتے ہیں۔'' ہم نے اثبات میں جواب دیا تو بولیں '' اگلی بار آپ جب بھی حیدرآباد جائیں تو چار مینار کے مچھلی کمان والے اور لاڑ بازار کے برابر والے مینار پر میرا نام ضرور تلاش کریں۔میں نے اُردو رسم الخط میں اپنا نام وہاں کھودا تھا۔''

ہم نے کہا'' بی بی! حیدرآباد میں اپنی زندگی کے بیس برس گزارنے کے باوجود آج تک ہم کبھی چار مینار پر نہ جا سکے۔اب آپ کی خاطر جائیں گے۔مگر یہ آپ کو اپنا نام وہاں لکھنے کی کیا سوجھی۔اب ہم بھی جواباً اپنا نام آپ کے ٹوکیو ٹاور پر اُردو رسم الخط میں لکھ جائیں گے۔''

بولیں'' جاپان میں آپ یہ نہ کر سکیں گے کیوں کہ ہمارے یہاں عمارتوں کو تصنیف و تالیف کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔آپ کے ہاں یہ رواج ہے کہ جہاں کہیں کوئی تاریخی عمارت دیکھی اس پر اپنا نام لکھ دیا۔میں نے بھی چار مینار پر اپنا نام محض اس لئے لکھا تھا کہ وہاں چار پانچ اصحاب پہلے ہی سے اپنے ناموں کو کندہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔میں نے سوچا کہ شاید آپ کے ہاں ایسا کرنے کا دستور ہے۔''

اس کا جواب مسز شاشورے کو ہم کیا دے سکتے تھے۔لہذا خاموش ہو گئے۔تاہم حیدرآبادیوں سے ہماری گزارش ہے کہ اگر انہیں یہ نام چار مینار پر دکھائی دے تو ہمیں ضرور اطلاع دیں۔ہم مسز شاشورے کو اس کی اطلاع دے دیں گے۔بے چاری بہت بے چین ہیں۔آپ کے حق میں دعا کریں گی۔

اتنے میں کچھ اور طلبا وہاں آ گئے۔ایک لڑکی کتابوں کا بوجھ لادے اچانک کمرے میں آئی اور اپنا تعارف

کراتے ہوئے بولی ''میں آیکوآوکی ہوں۔ مجھے افسوس ہے میں آج کی محفل میں نہ رہ سکوں گی۔ مجھے ایک ضروری کام ہے۔آپ سے معذرت کرنے آئی ہوں۔''

ہم نے پوچھا'' آپ کون سی کلاس میں پڑھتی ہیں؟''

شرما کر بولیں'' جی میں فارسی کی پروفیسر ہوں۔ پڑھتی نہیں پڑھاتی ہوں۔'' جاپانیوں کی عمر کا اندازہ لگانا بہت دشوار ہوتا ہے۔ہم اپنی مترجم ساکورآدا کے بارے میں یہ سمجھتے تھے کہ موصوفہ غیر شادی شدہ ہوں گی۔ جب شناسائی بڑھی تو پہلے یہ پتا چلا کہ دوسری جنگ عظیم میں ٹوکیو میں موجود تھیں۔ بعد میں ایک بار وہ ہمیں اپنے گھر لے گئیں تو دیکھا کہ گھر میں اُن کی عمر کی ان کی ایک بیٹی اور دو بیٹے موجود ہیں۔ جاپانی بہت عمر چور ہوتے ہیں اس لئے آدمی کو بہت محتاط رہنا چاہئے۔

پروفیسر سوزوکی ٹھیک دو بجے کمرے میں آئے تو ان کے ساتھ مہمانوں کا ایک جم غفیر آ گیا۔ ہندی کے پروفیسر تنا کا اور ہندوستانی تاریخ کے پروفیسر مسٹر ناکاموراؔ بھی آ گئے۔ پروفیسر سوزوکی نے ٹوکیو میں اُردو اور ہندی سے سروکار رکھنے والی ساری شخصیتوں کو جمع کر لیا تھا۔ ریڈیو جاپان کے ہندی شعبہ کے سربراہ مسٹر ناہارا بھی آ گئے۔ اوسا کا یونیورسٹی کے اُردو استاد مسٹر اسادہ بھی موجود تھے۔ مسٹر ست پرکاش گاندھی بھی وہاں ملے جو ٹوکیو یونیورسٹی میں اُردو کے استاد ہیں۔ پروفیسر سوزوکی کے چہیتے شاگرد ہیروشی ہاگیتا بھی ملے جو اُردو ادب کو سکھوں کی دین پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ (ہیروشی ہاگیتا ان دنوں ٹوکیو یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو ہیں) وہیں ایک صاحب مساوسوزکی ملے جن کے بارے میں معلوم ہوا کہ ایک خانگی کمپنی سلک روڈ پبلیشنگ کمپنی میں ملازمین کو اُردو پڑھاتے ہیں۔غرض ہر طرف اُردو بولنے والے موجود تھے۔ہمیں بڑا سکون محسوس ہوا۔

پروفیسر تنا کا چونکہ ہندی کے پروفیسر ہیں اس لئے ہم نے ان سے پوچھا'' آپ کے ہندی و بھاگ میں کتنے ودیارتھی شکشا پراپت کر رہے ہیں؟''

بولے'' میرے شعبہ میں ۶۰ طلباء زیر تعلیم ہیں۔'' ان کے منہ سے نہایت فارسی آمیز ہندی سن کر ہم بھونچکے رہ گئے۔ جاپان ریڈیو کے مسٹر اکی رانآہارا سے ہم نے پوچھا'' اور مہاشے جی آپ کے ریڈیو سے ہندی پرسارن کس سمئے ہوتا ہے۔'' بولے'' غالباً آپ جاپان ریڈیو کی ہنری نشریات کے نظام الاوقات کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔؟'' ہم نے کہا'' جاپان ریڈیو کا نظام الاوقات تو ہم بعد میں جانتے رہیں گے۔ پہلے یہ بتایئے کہ آپ ہندی پروگرام کے انچارج ہیں لیکن اتنی اچھی اُردو کیسے بول رہے ہیں۔''

مسٹر ناہارا بولے'' قبلہ یہ اُردو اور ہندی کے جھگڑے تو آپ کے ملک کو مبارک ہوں۔ ہمیں ان جھگڑوں سے کیا لینا دینا۔ دونوں زبانوں کی گرامر تقریباً یکساں ہے۔تھوڑی سی سنسکرت اور تھوڑی سی فارسی اور عربی سیکھ کر ہم حسب موقع

munotes.in

آپ کی اُردو اور ہندی دونوں زبانوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ ہم جاپانی کاروباری آدمی ٹھہرے۔ ایک تیر سے دو شکار کرنے کی ہمیں عادت ہے۔ جاپان میں جو آدمی ہندی جانتا ہے وہ اُردو بھی جانتا ہے اور جو اُردو جانتا ہے وہ ہندی بھی جانتا ہے۔''

ہم نے دل میں سوچا کہ اے کاش ہمارے ملک میں بھی لوگ زبانوں کے معاملہ میں کم از کم اتنے ہی کاروباری ہوتے تو ہندی اور اُردو کا جھگڑا نہ ہوتا۔ ٹوکیو یونیورسٹی میں ہمارے خیر مقدم کا حال تفصیل کا طلب گار ہے۔ لہذا اس قسط کو ہم یہاں ختم کرتے ہیں۔ بس اتنا بتاتے چلیں کہ ہماری خیر مقدمی تقریب دنیا کی طویل ترین خیر مقدمی تقریب تھی جو دو پہر میں دو بجے سے رات کے بارہ بجے تک جاری رہی۔

☆☆☆

munotes.in

بلٹ ٹرین میں کبھی نہ بیٹھو

صاحبو! جب سے جاپان آئے ہیں ہمیں اپنے وطن کی ریل گاڑیاں شدت سے یاد آرہی ہیں۔ٹوکیو میں ہماری آوارہ گردی کا واحد ذریعہ جاپانی ٹرینیں ہی ہیں ۔ یوں بھی سارا جاپان ٹرینوں میں بھاگتا پھرتا ہے۔ہم بھی ایک ٹرین سے اُترتے ہیں تو دوسری میں سوار ہوجاتے ہیں۔ دوسری سے اُترتے ہیں تو تیسری میں گُھس جاتے ہیں۔اب تو خیر ہمیں ان ٹرینوں میں بیٹھنے کی عادت ہوگئی ہے۔ابتداء میں ان میں بیٹھتے ہوئے ڈرلگتا تھا۔اس لئے کہ یہ ٹرینیں کسی بھی اسٹیشن پر ایک منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرتیں۔ ادھر ٹرین رُکتی ہے اور اُدھر ساری ٹرین کے دروازے خود بخود کُھل جاتے ہیں۔ اترنے والے اتر جاتے ہیں اور ٹرین میں چڑھنے والے چڑھ جاتے ہیں اور پھر دروازے خود بخود بند ہوجاتے ہیں۔ہمیں اکثر یہ ڈر ہوتا تھا کہ اگر ہمارا ایک پاؤں ڈبے میں اور دوسرا پاؤں پلیٹ فارم پر ہو اور ایسے میں ڈبے کا دروازہ خود بخود بند ہوجائے تو ہمارا جو ہونا ہے سو ہوجائے گا ہمارے بال بچوں کا کیا ہوگا۔لیکن جاپانی ٹرینیں بڑی سمجھدار ہوتی ہیں۔مسافر کا اتنا خیال رکھتی ہیں کہ سفر کرنے کا لطف ہی نہیں آتا۔ہم جب تک پوری طرح ڈبے میں داخل نہیں ہوتے تب تک ٹرین کے دروازے بند نہیں ہوتے۔ٹوکیو میں زیادہ تر ٹرینیں خانگی ریلوے کمپنیاں چلاتی ہیں۔حکومت کی طرف سے بھی ایک ٹرین چلائی جاتی ہے۔لیکن اس میں لوگ ذرا کم ہی بیٹھتے ہیں۔ کیوں کہ سرکاری ٹرین ہونے کی وجہ سے اس کا کرایہ دوسری ٹرینوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے اور کارگزاری بھی کچھ ایسی ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہر کمپنی کی ٹرین کا رنگ مختلف ہوتا ہے، نیلی پیلی لال ہری مٹیالی غرض ہر رنگ کی ٹرین ہوتی ہے۔کچھ ریل گاڑیاں زمین کے اوپر چلتی ہیں اور اکثر زمین کے نیچے چلتی ہیں۔ٹوکیو زمین کے اوپر جتنا آباد ہے اُتنا ہی زمین کے نیچے بھی آباد ہے۔کئی بڑے اسٹیشن زمین کے نیچے آباد ہیں۔

جاپان کی ریل گاڑیاں دنیا کی ترقی یافتہ ریل گاڑیاں سمجھی جاتی ہیں۔لیکن پھر بھی ہماری ریل گاڑیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ ہماری ریل گاڑیوں میں جو سہولتیں دستیاب ہیں وہ جاپانی ریل گاڑیوں میں ہرگز نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر ہم اپنے وطن کی ریل گاڑیوں میں اکثر دروازے سے لگے ہوئے ڈنڈے سے لٹک کر سفر کرتے ہیں تو بڑا لطف آتا ہے۔ یہ سہولت جاپانی ریل گاڑی میں بالکل نہیں ہے۔ہم جب بھی ٹرین کا سفر کرتے ہیں تو اپنی بش شرٹ یا پتلون ضرور

پھڑوا لیتے ہیں۔ یہ سہولت بھی جاپانی ٹرین میں نہیں ہے۔ پھر جاپانی ٹرینوں کے مسافر بھی بڑے بداخلاق ہوتے ہیں۔ کسی سے کوئی بات نہیں کرتے۔ بھلا یہ سفر کرنے کا کوئی طریقہ ہوا۔ہم جاپانی ٹرینوں میں پچھلے ایک مہینے سے سفر کر رہے ہیں۔کسی مسافر نے پلٹ کر یہ نہیں پوچھا کہ میاں کہاں رہتے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟ بال بچے کتنے ہیں؟ کتنے بچوں کی شادیاں ہو چکی ہیں؟ آپ کے شہر میں پیاز کا کیا بھاؤ ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ جاپانی لوگ ٹرین میں سفر کرتے وقت ''مون برت'' رکھ لیتے ہیں۔ پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ٹرین آتی ہے تو کتاب میں انگلی رکھ کر ٹرین میں گھس جاتے ہیں اور سیٹ پر بیٹھتے ہی پھر کتاب کھول کر پڑھنے لگ جاتے ہیں۔ہمیں اکثر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی لائبریری میں بیٹھے ہیں اور لائبریری کے نیچے پہیے لگا دیے گئے ہیں۔ جاپانی یا تو پڑھتے ہیں یا لکھتے ہیں۔ بات بہت کم کرتے ہیں۔ انہیں کون سمجھائے کہ میاں ریل گاڑیوں میں لوگ چہرے پڑھتے ہیں، کتابیں نہیں پڑھتے۔ ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرتے ہیں اور حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتے ہیں۔ جاپانیوں کو سفر کرنا بالکل نہیں آتا۔اس معاملے میں یہ ہم سے بہت پیچھے ہیں۔صرف آرام دہ ریل گاڑیاں بنانے سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔سفر کرنے کے کچھ آداب بھی ہوتے ہیں جس سے جاپانی بالکل واقف نہیں ہیں۔ہمیں جاپانی ریل گاڑیوں سے ایک شکایت یہ بھی ہے کہ یہ بہت ٹھیک وقت پر چلتی ہیں۔ انتظار میں جو لذت ہوتی اس کا مزہ جاپانیوں کو کیا معلوم۔ ایسے ہی کئی معاملات ہیں جن میں جاپانی ہم سے بہت پیچھے ہیں۔آپ یقین کریں کہ ہمیں ٹوکیو میں کسی بھی اسٹیشن پر ٹرین کے لئے دو منٹ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ایک ٹرین جاتی ہے تو دوسری اس کے پیچھے آ جاتی ہے۔اور پھر ان کی رفتار بھی ایسی تیز کہ آدمی کا کلیجہ منہ کو آ جائے۔ پتہ نہیں انہیں کہاں جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ہماری ریل گاڑیاں اسٹیشن میں داخل ہونے سے پہلے بیرونی سگنل کے پاس ضرور رُکتی ہیں۔سیٹیاں بجاتی ہیں اور مسافر کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر سگنل کو دیکھتے ہیں۔کتنا مزہ آتا ہے۔لگتا ہے جاپانی ریل گاڑیوں کا کوئی سگنل ہی نہیں ہوتا۔بس منہ اٹھائے کسی بھی اسٹیشن میں گُھس جاتی ہیں۔

ہم نے جاپان کی بلٹ ٹرین کی شہرت بہت سنی تھی۔اس میں بھی سفر کر کے دیکھ لیا بالکل واہیات گاڑی ہے۔ہمیں بلٹ ٹرین میں بیٹھ کر کیوٹو جانا تھا۔ یونیسکو کے عہدیدار شنجی تاجیما سے کیوٹو کا فاصلہ پوچھا۔معلوم ہوا کہ تقریباً پانچ سو کلومیٹر سے کچھ اوپر کا فاصلہ ہے۔اب آدمی اتنے لمبے سفر پر جاتا ہے تو سفر کی تیاریاں بھی کرتا ہے۔ہم نے پوچھا اتنا لمبا سفر ہے بستر بند بھی ساتھ رکھ لیں۔شنجی تاجیما نے ہنس کر کہا''اس میں سونے کی جگہ ہی کہاں ہوتی ہے کہ آپ اپنا سفر لگا سکیں۔''

پوچھا''راستہ میں پانی کے لئے صراحی یا لوٹا رکھ لیں۔؟''

تاجیما نے کہا''پانی آپ کو ٹرین میں مل جائے گا۔''

پوچھا''اور توشہ دان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

تاجیما نے کہا ''صبح ناشتہ کر کے ٹوکیو سے چلیں گے دوپہر کا کھانا کیوٹو میں کھالیں گے۔''

ہم نے کہا '' یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ہمارے ہاں چھ سو کلومیٹر کے فاصلے والے سفر کے لئے کم از کم دو وقت کا کھانا، بھری ہوئی ایک صراحی، ایک لوٹا ایک بستر بند اور دو تکیے رکھنا ضروری ہوتا ہے۔''

شنجی تاجیما چونکہ ہندوستان میں ایک سال رہ چکے ہیں اور ہماری ٹرینوں میں سفر کا خاصہ لمبا تجربہ رکھتے ہیں۔ اسی لئے شرما کر بولے '' مجھے آپ کی مجبوری کا اندازہ ہے۔ ہندوستان میں سفر کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ مجھے ایک بار آپ کی ٹرین میں چالیس گھنٹوں تک بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان چالیس گھنٹوں میں میرے ساتھی مسافر کی دو صراحیاں ٹوٹی تھیں اور سارے ڈبے میں جل تھل ہو گیا تھا۔ ہر اسٹیشن پر اُتر کر لوٹوں میں پانی بھرنے کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ ہماری ٹرینوں میں یہ سہولت نہیں ہوتی۔''

ہمیں بتایا گیا کہ کیوٹو جانے کے لیے ٹوکیو سنٹرل اسٹیشن سے بلٹ ٹرین ٹھیک آٹھ بج کر اکتالیس منٹ پر نکلے گی۔ ہم نے سوچا یہ صرف ایک دھونس ہے جو ہم پر جمائی جارہی ہے۔ بھلا کونسی ٹرین وقت پر چلتی ہے۔ ہم ٹوکیو سنٹرل اسٹیشن پر پہنچے تو ساڑھے آٹھ جب چکے تھے اور بلٹ ٹرین کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ ہم نے تاجیما کو چھیڑنے کے انداز میں کہا '' حضرت وہ جو بلٹ ٹرین ۸ بج کر ۴۱ منٹ پر چلنے والی تھی وہ کہاں ہے؟''

تاجیما نے کہا بس آتی ہی ہوگی۔ ٹھیک آٹھ بج کر پینتیس منٹ پر بلٹ ٹرین پلیٹ فارم پر نمودار ہوئی۔ اس کا انجن طیارے کی شکل کا ہوتا ہے۔ دیکھنے میں بہت خوبصورت ہوتی ہے۔ اس میں سولہ ڈبے لگے ہوتے ہیں۔ ساری ٹرین ایر کنڈیشنڈ ہوتی ہے۔ ہم ٹرین میں داخل ہوئے تو یوں لگا جیسے ہم طیارے میں پہنچ گئے ہیں۔ نشستوں کا انتظام بھی اسی طرح کا ہوتا ہے۔ یہ ٹرین ہانشو جزیرے میں واقع ٹوکیو سے کیوشو میں واقع ہکاتا تک ایک ہزار ستّر کلومیٹر کا فاصلہ تقریباً چھ گھنٹوں میں طے کرتی ہے۔ یہ دنیا کی سب سے تیز رفتار ٹرین سمجھی جاتی ہے کیوں کہ یہ ایک گھنٹہ میں ۲۱۰ کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے۔

ہم ٹرین میں بیٹھے اپنی گھڑی کو دیکھ کر رہے تھے کہ ٹھیک آٹھ بج کر اکتالیس منٹ پر ٹرین گولی کی طرح اسٹیشن سے نکلی۔ تب ہمیں یقین آیا کہ اس ٹرین کو بلٹ ٹرین کیوں کہتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ کہ ہر دس منٹ کے بعد ایک بلٹ ٹرین ہاکاتا کے لیے نکلتی ہے۔ ان ٹرینوں کی سب سے بڑی خوبی ان کی پابندیٔ وقت ہے۔ ہمیں بتایا گیا کہ اگر کبھی ٹرین دس منٹ لیٹ ہو جائے تو مسافروں کو سارا کرایہ واپس کر دیا جاتا ہے۔ ان ٹرینوں میں آٹو میٹک کنٹرول ہوتا ہے۔ کبھی ٹرین کی رفتار تیز ہو جائے تو ٹرین کو خود بخود بریک لگ جاتے ہیں۔ جاپان میں زلزلے بہت آتے ہیں۔ جیسے زلزلہ آتا ہے ٹرین خود بخود رُک جاتی ہے۔ پٹریوں کی سلامتی کے بارے میں سگنل بھی سیکنڈوں میں ملتے ہیں۔ ہر ٹرین کا ٹیلی فونی ربط

ایک دوسرے سے اور ساری ٹرینوں کا ربط ٹوکیو کے سنٹرل اسٹیشن سے ہوتا ہے۔ بلٹ ٹرین سے سفر کر کے ہمیں اس بات کا دکھ ہوا کہ اس میں دھکّے نہیں لگتے۔ ٹرین کے چلنے کی آواز بھی اندر سنائی نہیں دیتی۔ دھکّے نہ لگنے اور آواز نہ آنے کے باعث اس کی رفتار کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ ہمیں بھی اس کی رفتار کے بارے میں شبہ ہوگیا تھا۔ ہمارے دوست نے ہمیں ڈائننگ کار میں لے جا کر ٹرین کا میٹر دکھایا۔ سچ مچ ٹرین ۲۱۰ کلومیٹر کی رفتار سے چل رہی تھی۔

صاحبو! اگر آپ کو بلٹ ٹرین کے ذریعے ٹوکیو سے کیوٹو جانے کا موقع ملے تو اپنے دل پہ قابو رکھیں۔ اس لئے کہ جاپان کا قدرتی حُسن آپ کو مسحور کر دے گا۔ بائیں طرف سمندر آپ کے ساتھ ساتھ چلے گا۔ چھوٹے چھوٹے جزیرے نظر آئیں گے اور دائیں طرف فیوجی پہاڑ نظر آتا رہے گا جو وقفہ وقفہ سے بڑا ہوتا جائے گا۔ ٹرین میں سے فیوجی پہاڑ کا نظارہ خود حیران کر دینے والا ہوتا ہے۔ آپ کو ناگویا کا شہر بھی ملے گا جو جاپان کا چوتھا بڑا شہر ہے۔ ناگویا کا قلعہ بڑی شہرت رکھتا ہے جو دوسری جنگ عظیم میں برباد ہوگیا تھا۔ اسے ۱۹۵۹ء میں دوبارہ تعمیر کیا گیا۔ تین گھنٹوں کے سفر میں ہم نے جاپان کا جو حُسن دیکھا وہ زندگی بھر ہمارے دل پر نقش رہے گا۔ خدا کرے یہ ہمیشہ ہماری یادداشت کا ایک اثاثہ بنا رہے۔ دوسری جنگ عظیم بھی یاد آئی جس میں اس قدرتی حُسن پر بمباری کی گئی تھی۔ ان ہی جگہوں پر کہیں آگ اور بربادی کا ناٹک کھیلا گیا ہوگا۔ پھر ہیروشیما بھی تو یہاں سے پاس ہے۔ انسان جب از سرِ نو جینے کا اہتمام کرتا ہے تو بربادیوں کے نشان خود بخود مٹ جاتے ہیں۔

بلٹ ٹرین میں ٹیلی فون کی سہولت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ بلٹ ٹرین میں سفر کرتے کرتے ہم نے اوساکا کو فون کیا اور اُردو کے استاد مسٹر اسادہ کو یہ مژدہ سنایا کہ ہم کیوٹو آ رہے ہیں۔ ٹرین میں وقفہ وقفہ سے اعلانات ہوتے رہے کہ باہر کا موسم ایسا ہے، ہم اتنا فاصلہ طے کر چکے ہیں، اب فلاں اسٹیشن آنے والا ہے وغیرہ وغیرہ۔

تقریباً پونے تین گھنٹوں بعد جب ہم کیوٹو پہنچے اور گھڑی دیکھی تو پتہ چلا کہ گاڑی کے پہنچنے کے وقت میں آدھے منٹ کا بھی فرق نہیں ہے۔ ٹوکیو میں بھی ہمیں ایک بار ایک ٹرین سے سگاموا سٹیشن جانا تھا اپنے ایک دوست سے ملنے کے لئے۔ اسٹیشنوں کے نام جاپانی میں لکھے ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں انگریزی میں بھی نام لکھے ہوتے ہیں۔ چونکہ ہم اکیلے سفر کر رہے تھے۔ اس لئے ایک صاحب سے سگاموا سٹیشن کی پہچان پوچھی تو ان صاحب نے کہا ۱۱ بج کر ۷ ۳منٹ پر جو بھی اسٹیشن آئے اُتر جایئے وہ سگاموا سٹیشن ہی ہوگا اور ہم ٹھیک ۱۱ بج کر ۷ ۳ منٹ پر سگاموا سٹیشن پر موجود تھے۔

بلٹ ٹرین سے اترنے کے بعد ہمارے دوست شنجی تاجیما نے پوچھا ''آپ کا سفر کیسا رہا۔؟'' ہم نے کہا ''مسٹر تاجیما آپ ہندوستان کی ٹرینوں میں سفر کر چکے ہیں۔ ہماری ٹرینوں میں جو سہولتیں ہوتی ہیں وہ آپ کے ہاں کہاں۔ وہ سفر ہی کیا جس میں آدمی کو دھکّا نہ لگے۔ ہم نے تین گھنٹے آپ کی ٹرین میں سفر کیا۔ کسی نے ہمارے سر پر صندوق نہیں رکھا۔ کسی

munotes.in

کا ہولڈال ہمارے پاؤں پر نہیں گرا۔کسی مسافر نے نشست کے لئے دوسرے مسافر سے لڑائی نہیں کی اور پھر وہ ہر اسٹیشن پر چائے لے لو چائے لے لو، پان بیڑی سگریٹ والی مانوس آوازیں نہیں سنائی دیں۔بھلا یہ بھی کوئی ٹرین کا سفر ہے۔‘‘

تاجیما نے شرم کے مارے نظر نیچی کرلیں۔بولے’’ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ہمارا ملک چھوٹا ہے اور آپ کا ملک عظیم۔‘‘اور تاجیما کی یہ بات سن کر ہمارا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔

لہذا صاحبو! کبھی جاپان جاؤ تو بلٹ ٹرین میں بالکل نہ بیٹھو۔بڑی واہیات ٹرین ہے۔بلٹ ٹرین میں بیٹھنے سے بہتر یہی ہے کہ آدمی ہوائی جہاز میں بیٹھ جائے۔

☆☆☆

munotes.in

ٹوکیو کے بازاروں میں

بازار چاہے دہلی کے ہوں یا ٹوکیو کے ان سے ہمارا کوئی رشتہ آج تک قائم نہ ہوسکا۔

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں

ٹوکیو کے بازار دنیا بھر کی چیزوں سے بھرے پڑے ہیں۔ بہت سی چیزوں کے بارے میں تو ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کس کام آتی ہیں اور ان کے خریدار کون ہیں۔ یوں بھی ٹوکیو میں ہمیں جاپانیوں کی محبت اور خلوص کے سوائے کچھ نہیں خریدنا تھا کیوں کہ یہی وہ شئے ہے جس پر وطن عزیز میں کسٹم والے کوئی ڈیوٹی نہیں لگاتے۔ وہ لاکھ تلاشی لیں مگر ہمارے دل میں چھپی ہوئی محبت کی دولت کو کہاں پکڑ سکتے ہیں۔ پھر سو باتوں کی ایک بات یہ کہ دن بھر میں تین وقت کا کھانا خریدنے کے بعد ہماری جیب میں کوئی اور چیز خریدنے کی گنجائش کہاں باقی رہتی تھی۔ البتہ ایک چیز ہم جاپان میں ضرور خریدنا چاہتے تھے اور وہ ہے ہمارا لباس۔ جاپان جاتے ہوئے ہم بڑی مشکل سے کپڑوں کے تین جوڑے لے گئے تھے۔ سوچا تھا جاپان جا کر اپنے لئے بڑھیا کپڑے خریدیں گے بلکہ ہم تو کپڑوں کا ایک ہی جوڑا لے جانے والے تھے۔ مگر خدا بھلا کرے ہماری اہلیہ محترمہ کا کہ انہوں نے زبردستی دو پرانے جوڑے مزید ہمارے سامان میں رکھ دئے۔ اب جو جاپان جا کر ہم نے ٹوکیو کے بازاروں میں اپنے لئے کپڑے تلاش کرنے شروع کئے تو پتہ چلا کہ ان کے کپڑوں میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ ہمیں اپنے اندر سمو سکیں۔ جاپانیوں کا قد بہت چھوٹا ہوتا ہے اسی لئے وہ اپنے حساب سے کپڑے تیار کرتے ہیں۔ کوئی پتلون کمر میں صحیح آتی تو پائنچے چھوٹے ہو جاتے اور پائنچے صحیح ہوتے تو پتلون کمر میں تنگ ہو جاتی تھی۔ یہی حال شرٹس کا بھی ہوا۔ ٹوکیو کا چپہ چپہ چھان مارا۔ ہمیں اپنے سائز کے کپڑے نہ ملے۔ لوگوں نے کہا کپڑا خرید کر سلوا لیجئے۔ ہم اس خیال سے متفق بھی ہو گئے لیکن اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے احتیاطاً سلائی کے دام پوچھے تو پتہ چلا کہ کپڑے کے دام سے دس گنا زیادہ ہونگے۔ ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور کے بارے میں پتہ چلا کہ وہاں امریکیوں کی سائز کے کپڑے ملتے ہیں۔ ہم وہاں بھی گئے۔ کپڑے سائز کے مطابق نکلے مگر جاپانیوں نے ان تیار کپڑوں کے دام امریکیوں کی معاشی خوشحالی کے حساب سے رکھے تھے۔ یوں کپڑوں کی طرف سے ایسے مایوس ہوئے کہ چار و نا چار اپنے تین پرانے جوڑوں پر ہی جاپان میں اپنے سارے قیام کو نپٹایا۔ رات میں چوری سے اپنے ہوٹل میں کپڑے کا ایک جوڑا دھوتے

munotes.in

تھے اور دوسرے دن خود اپنے ہاتھوں ان پر استری پھیر لیتے تھے۔ جاپان جانے کے بعد ہی ہم نے کپڑوں پر استری کرنے کا گُر سیکھا۔ صاحبو! اگر آپ کا قد پانچ فٹ دس انچ اور آپ کا وزن ۷۰ کلوگرام ہے اور اس کے باوجود اگر آپ کو جاپان جانے کا موقع ملے تو اپنے کپڑے اپنے ساتھ لے جایئے۔ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ اس معاملے میں جاپانیوں پر بالکل بھروسہ مت کیجئے۔

جب ہمیں احساس ہوگیا کہ ہم جاپانیوں کے بازاروں سے کچھ نہیں خرید سکتے تو ہم ان بازاروں میں بے دھڑک گھومنے لگے۔ اسی لئے ہم جاپان کے بازاروں کے بارے میں اور لوگوں کے مقابلے زیادہ جانتے ہیں۔ ہم ہر شام جاپان کے بازاروں میں کھو جاتے تھے۔ ہمارا ریلوے پاس اکھیابارا کے اسٹیشن پر ختم ہوتا تھا اور اکھیابارا نہ صرف ٹوکیو بلکہ سارے جاپان کا سب سے بڑا الکٹرانک اشیا کا بازار ہے۔ وہ الکٹرانک اشیا جن سے جاپان ساری دنیا میں جانا اور پہچانا جاتا ہے وہ یہاں فروخت ہوتی ہیں۔ ایک سے ایک عالیشان دکان ہے جن میں انواع واقسام کے ریڈیو، ٹرانزسٹر، ٹیلی ویژن، کیلکو لیٹر، واکی ٹاکی، گھڑیاں اور کیمرے فروخت ہوتے ہیں۔ لوگ سبزیوں کی طرح الکٹرانک اشیا خریدتے ہیں۔ یہاں جاکر ہمیں جاپانیوں کی عظمت کا احساس بھی ہوتا تھا اور ان پر ترس بھی آتا تھا۔ مانا کہ جاپان الکٹرانک اشیا کی تیاری کے مقابلے میں اس وقت دنیا میں سب سے آگے ہے۔ دنیا بھر میں اس کی سیکو اور سٹی زن گھڑیاں، نیشنل پیناسونک ریڈیو، ہٹاچی اور سونی کے ٹرانزسٹروں، یشیکا کے کیمروں، ٹویوٹا اور ڈٹسن کی موٹروں کی دھوم ہے۔ مگر دنیا والوں کو جاپان کے ادیبوں، فنکاروں اور آرٹسٹوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ جاپان کے باہر کوئی ان کے نام نہیں جانتا۔ جاپان کے ادب، آرٹ اور کلچر کو بنانے والے ٹرانسٹروں، گھڑیوں، کیمروں اور موٹروں کے نیچے دب گئے ہیں۔ ہم نے کئی جاپانی فنکاروں سے مذاق میں کہا، میاں! چیزیں ضرور بناؤ مگر اتنی اچھی بھی نہ بناؤ کہ تم خود پس پشت چلے جاؤ۔ چیزیں جاپان کی شناخت کا حصہ ضرور بنیں۔ مگر تم بھی تو جاپان کی شناخت کا حصہ بنو۔ ہم بھی چیزیں بناتے ہیں مگر یہ ہم سے زیادہ مقبول نہیں ہیں۔ بھلے ہی ہمارے ٹرانزسٹروں، کیمروں اور موٹروں کو کوئی نہ پوچھتا ہو مگر ہمارے کالی داس، کبیر، میرابائی، امیر خسرو، غالب، میر، رابندر ناتھ ٹیگور اور ڈاکٹر اقبال کو ساری دنیا جانتی ہے۔ جاپانی فنکار ہماری بات کو مذاق میں ٹال دیتے تھے۔ ہوگی کوئی مصلحت ان کی۔ صاحبو! ان سب باتوں کے باوجود ٹوکیو جاؤ تو اکھیابارا ضرور جاؤ۔ بشرطیکہ آپ اپنی عقل کو دنگ اور زبان کو گُنگ کرنا چاہیں۔ یہاں قدیم جاپان کی جھلک اب بھی دکھائی دیتی ہے۔ جاپانی خواتین اور مرد اب بھی جاپان کے روایتی لباس کیمونو میں دکھائی دیتے ہیں کیمونو پہننے کے بعد جاپانی عورت کی چال میں عجیب سی طرحداری پیدا ہوجاتی ہے جو قدموں کو ناپ ناپ کر رکھنے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ علاقہ ٹوکیو کے دیگر علاقوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں کے بازاروں کی سجاوٹ بھی روایتی ہے۔ اساکسا میں ہی آپ کو جاپان کی گیشا لڑکیاں دکھائی دیں

گی۔ ویسے اب گیشا لڑکیاں کم سے کم ہوتی جا رہی ہیں۔ زمانہ جو ترقی کر رہا ہے۔ ہم نے جتنی بھی گیشا لڑکیاں دیکھیں وہ سب کی سب ۳۵ برس سے زیادہ کی تھیں۔ آپ کو ان کی عمروں سے کیا لینا دینا۔ آپ تو بس ٹوکیو کے چاندنی چوک یعنی اساکُسا کو دیکھنے جایئے اور قدیم جاپان کی ایک جھلک دیکھ کر آ جایئے۔ مگر ذرا جلدی کیجئے۔ کہیں یہ جھلک ختم نہ ہو جائے۔ کیا کریں زمانہ جو ترقی کر رہا ہے۔

اساکُسا میں ہی کنین کا مشہور بودھ مندر ہے جو ساتویں صدی عیسوی میں بنایا گیا تھا۔ لکڑی کا بنا ہوا ہے مگر اس کی طرز تعمیر آپ کو حیرت میں ڈال دے گی۔ وہ چودھویں کے چاند کی رات تھی جب ہم اس مندر کو دیکھنے گئے تھے۔ لوگ دھڑا دھڑ اس مندر میں عبادت کے لئے آ رہے تھے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مندر کے آگے کھڑے ہو جاتے۔ پوجا کا یہ طریقہ ہمیں خالص ہندوستانی لگا۔ جاپان کے دو بڑے مذہب ہیں۔ بودھ مت اور شنٹومت۔ شنٹومت جاپان کا قدیم مذہب ہے مگر عموماً سارے جاپانی دونوں مذاہب پر یقین رکھتے ہیں۔ شادی شنٹو مندر میں کرتے ہیں تو ان کی آخری رسومات بودھ مت کے عقیدوں کے مطابق انجام پاتی ہیں۔ ایک جاپانی دوست نے ہمیں بتایا تھا کہ بھیا! ہم تو کاروباری آدمی ہیں دونوں مذہبوں پر یقین رکھتے ہیں۔ پتہ نہیں کب کون سے مذہب سے کام پڑ جائے۔

ٹوکیو کے سب سے مشہور علاقے دو ہیں۔ ایک کا نام گنزہ ہے اور دوسرے کا شنجوکو۔ گنزہ کو جاپان کا شوکیس کہا جاتا ہے۔ دکانوں کی سجاوٹ، بازاروں کی رونق، روشنیوں کی جگمگاہٹ، انسانوں کی ریل پیل، گنزہ کو چاندی کی طرح چمکدار بنا دیتی ہے۔ یوں بھی جاپانی میں گنزہ چاندی کو کہتے ہیں۔ یہاں جاپان کے سب سے عالیشان تھیٹر، سنیما گھر، ریستوران اور دکانیں آباد ہیں۔ یہیں کے ایک کابکی تھیٹر میں ہم نے ایک کابکی شو بھی دیکھا تھا۔ ''کابکی'' کو موسیقی ریز ڈرامہ کہہ لیجئے۔ اس میں کابکی کا نہیں بلکہ قصور ہمارا تھا کہ یہ ہمیں پسند نہیں آیا۔ یہاں کی ایک ہندوستانی ریستوران میں ہم نے اپنے جاپانی دوستوں کو کھانے پر بلایا تھا۔ (ریستوران کا نام نہیں بتائیں گے کیونکہ ہم وطنوں کی برائی کرنا دیش سے غداری ہے) بیرے سر پر پگڑی باندھے کارٹون بنے پھرتے ہیں مگر بعد میں گاہکوں کی پگڑی اُچھالتے ہیں اور اُنھیں کارٹون بنا دیتے ہیں۔ بہت دنوں سے بریانی نہیں کھائی تھی سو بریانی منگائی، قورمہ تو ہر کوئی کھاتا ہے۔ ہم چھ دوست تھے۔ جانے لگے تو لتا منگیشکر کے ایک فلمی گیت کی مدھر دھن کی آڑ میں بیرے نے ہم سے ہنستے ہنستے بیس ہزار ین وصول کر لئے۔

صاحبو! اپنے دیش کا کھانا اپنے ہی دیش میں اچھا لگتا ہے۔ بعد میں ہم ٹوکیو کے اور بھی کئی علاقوں کے ہندوستانی ریستورانوں میں گئے۔ کھانا کھانے کے لئے نہیں بلکہ ان کا ٹائیلٹ روم استعمال کرنے اور لتا منگیشکر یا محمد رفیع کا گیت سننے۔ ایشیائی ثقافتی مرکز کے ڈائریکٹر مسٹر یماوکا ہمیں اکثر گنزہ لے جاتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ جاپان کے شرفا کا علاقہ ہے۔ مگر چند دنوں بعد ہمارے نوجوان دوست شنجی تاجیما نے ہمیں طعنہ دیا کہ جو لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں وہ مجبوراً

شریف بن جاتے ہیں۔ آپ تو خدا کے فضل سے ابھی اتنے بوڑھے نہیں ہوئے کہ اپنی مرادوں کی شامیں گنزہ میں برباد کریں۔ میرے ساتھ شنجوکو چلیے جہاں جاپان کے نوجوانوں کی شامیں گزرتی ہیں۔ ہم فوراً سینگ کٹا کر بچھڑوں کو جا ملے، جیسا کہ ہماری عادت ہے اور پھر اس کے بعد جتنے دن ٹوکیو میں رہے اپنے وجود سے شنجوکو کی شاموں کو روشن اور معطر کرتے رہے۔ ہائے وہ شنجوکو کی شامیں! لفظوں میں اتنی سکت کہاں کہ وہ ان شاموں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ سکیں۔ روشنی میں نہاتے ہوئے تروتازہ بدن، نوجوانوں کے بہکتے قدم، ان کی سرگوشیاں، ان کی بے نیازیاں، سچ جانیئے ہم تو ان شاموں سے یوں گزرتے تھے جیسے کوئی گہری نیند میں کسی اچھوتے خواب سے گزر جاتا ہے۔ ہمارے بزرگ دوست مسٹر یماوکا نے پھر شرفا کے علاقے کا حوالہ دے کر ہمیں گنزہ لیجانا چاہا مگر ہم نے صاف کہہ دیا کہ اگلی بار اگر ٹوکیو آنا ہوا تو انشاء اللہ گنزہ میں ضرور اپنی شامیں گزاریں گے اور عمر رفتہ کو آواز دیں گے۔ مگر اب تو شنجوکو کی شامیں ہمیں آواز دے رہی ہیں۔ لِللّٰہ ہمیں نہ روکیے۔ ہر چراغ گل ہونے سے پہلے بھڑکتا ہے۔ سو ہمیں بھی بھڑکنے دیجئے۔ شام ہوتے ہی ہم اپنی نوجوان جاپانی دوستوں کے ساتھ شنجوکو کی بانہوں میں پہنچ جاتے تھے۔

شنجوکو میں ٹوکیو کی کئی بلند عمارتیں ہیں۔ ساری عمارتیں زلزلہ پروف ہیں۔ زلزلہ آئے تو یہ اسی طرح ہلتی ہیں جس طرح تیز ہوا میں پیڑ ہلتے ہیں۔ مگر زلزلہ تھمتے ہی پھر اپنی اصلی حالت میں آ جاتی ہیں۔ ہمیں شنجوکو کی نومرا بلڈنگ بہت پسند تھی جس کی پچاسویں منزل پر شیشے کا گھر تھا۔ اس بلڈنگ کی لفٹ اتنی تیز رفتار ہے کہ آدھے منٹ میں پچاسویں منزل پر پہنچا دیتی ہے۔ ہم سرِ شام شیشے کے اس گھر میں جا کر بیٹھ جاتے تھے۔ چاروں طرف دور دور تک ٹوکیو ہی ٹوکیو دکھائی دیتا ہے۔ ہمیں یہ بلڈنگ اس لئے پسند تھی کہ یہاں سے فیوجی پہاڑ کا نظارہ بڑا دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ ویسے تو فیوجی پہاڑ ٹوکیو سے ڈھائی تین سو کلومیٹر دور ہے مگر نومرا بلڈنگ کے اس شیشہ گھر میں بیٹھے بیٹھے اکثر ہمارا جی چاہتا تھا کہ ہم شیشہ گھر کی کھڑکی سے باہر ہاتھ نکال کر فیوجی پہاڑ کے سر پر سے اُس برفانی ٹوپی کو اُچک لیں جو پہاڑ کا طُرّہ امتیاز ہے۔ ہم گھنٹوں فیوجی پہاڑ کو گھورتے رہتے تھے۔ پھر جب رات کا اندھیرا اترنے لگتا اور فیوجی پہاڑ کی برفانی ٹوپی دھندلی ہونے لگتی تو ہم اپنی نظروں کو وہاں سے ہٹا کر ٹوکیو کی جگمگاتی اور دوڑتی بھاگتی سڑکوں پر ڈال دیتے تھے۔ لاکھوں موٹریں اور ہزاروں ٹرینیں نہ جانے کہاں بھاگی پھرتی ہیں۔ انہیں کیا پتہ کہ ایک پردیسی نومرا بلڈنگ کی پچاسویں منزل پر بیٹھا ان کی بھاگ دوڑ کا مزہ لے رہا ہے۔

درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغِ رہ گزر کو کیا خبر ہے

ٹوکیو کی آخری شام بھی ہم نے نومرا بلڈنگ کے شیشہ گھر میں گزاری تھی۔ فیوجی پہاڑ کو ہم نے اس شام اس قدر

گھورا کہ ہمیں یقین ہے کہ اس کی ٹوپی کی برف ضرور پگھل گئی ہوگی۔ اس کی برفانی ٹوپی پگھلی ہو یا نہ ہو ہم تو پگھل گئے تھے اور اپنی ہی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپک پڑے تھے۔ کچھ یادیں ہی ایسی ہوتی ہیں جو دل سے اُبھر کر آنکھوں سے چھلک جاتی ہے۔

صاحبو! ہم تو خواہ مخواہ سنجیدہ ہو گئے۔ خود بھی رنجور ہوئے آپ کو بھی ملول کیا۔ آپ کو فیوجی پہاڑ کی برفانی ٹوپی سے اور ہماری یادوں سے کیا مطلب۔ بس اتنی گزارش ہے کہ کبھی ٹوکیو جانا ہو تو نومرا بلڈنگ کی پچاسویں منزل پر ضرور جانا۔ ہماری آنکھوں سے فیوجی پہاڑ کو دیکھنا، وہاں کے کافی ہاؤس میں ہمارے ہونٹوں سے چائے پینا۔ ہمارے ہاتھوں سے شیشہ گھر کی ریلنگ کو ضرور چھونا۔ وہیں کہیں ہمارا اور ہمارے دوستوں کا لمس بھی ہوگا۔ یہ کرنا مت بھولنا۔ سمجھ گئے نا۔ تو پھر رہا وعدہ!

☆☆☆

munotes.in

صغرا مہدی

ذرا یہیں پڑوس میں

ہوش سنبھالا تو ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا۔ یہ احساس ہوا کہ یہ جو ملک وجود میں آیا ہے وہ ہمارا نہیں ہے وہ نہ صرف ہمارا نہیں بلکہ اس سے چڑنا اسے بُرا کہنا عین حبّ الوطنی ہے۔ مگر ابتدا ہی میں اس ملک سے ایک تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ یہ کہ ہماری باجی روتی دھوتی شادی کے بعد پاکستان گئی تھی۔ باجی جو ہندوستان کی عاشق، گاندھی جی کی عقیدت مند اور پنڈت نہرو کی فین تھیں۔ وہ جاتے وقت بہت روئیں تو ذاکر صاحب نے ان سے کہا تھا'' ارے بھئی روتی کیوں ہو اب یا تو تم یہاں آ کر لال قلعے پر جھنڈا لہرانا پھر ہم لاہور کے قلعے پر اپنا جھنڈا گاڑیں گے۔'' (واضح رہے کہ ذاکر صاحب اس وقت جامعہ کے شیخ الجامعہ تھے۔ ہمارے خاندان میں ان کی حیثیت عزیزوں جیسی تھی) ہمارا سب سے چھوٹا بھائی اس وقت دس سال کا تھا۔ وہ بھی پاکستان سے لڑنے کے پروگرام بناتا مگر پھر یہ سوچ کر ملتوی کہ وہاں ہماری باجی بھی تو ہیں۔

باجی پاکستان سے آتیں تو اسی طرح روتیں، جس طرح وہ پہلی مرتبہ پاکستان جاتے وقت روئی تھیں، ایسے حالات بھی ہوئے کہ دس سال تک وہ ہندوستان نہیں آسکیں، نہ خوشی میں نہ دکھ میں۔ کبھی کبھی تو خط و کتابت بھی دوسرے ملکوں میں رہنے والے دوستوں اور عزیزوں کے وسیلے سے ہوئی، مگر باجی کی ہندوستان سے محبت میں کوئی فرق نہیں آیا اور انھوں نے اپنے بچوں کے دل میں بھی ہندوستان سے نفرت نہیں بیٹھنے دی۔ وہ جب بھی یہاں آتے تو گھبرائے گھبرائے رہتے کہ ہندوستان کے مخالف کوئی بات ان کے منہ سے نہ نکل جائے۔ مگر چھوٹے بچے اپنے پر اس حد تک قابو نہ رکھ پاتے اور ہندوستان کے خلاف کچھ نہ کچھ کہہ جاتے۔

بڑوں میں ہندوستان، پاکستان کی گرما گرم بحثیں ہوتیں، وہاں سے جو عزیز آتے تو ان کی مہمان داری کے ساتھ ساتھ ان سے خوب لڑائیاں بھی ہوتیں، دونوں ایک دوسرے کے ملکوں، وہاں سیاست پر خوب لڑتے جھگڑتے ہم بھی اپنے نوعمر پاکستانی مہمانوں سے ہندوستان کی حمایت میں لڑتے اور ایک دفعہ تو ہاتھا پائی کی نوبت بھی آ گئی اور ہمارا مقدمہ ماموں جان کی عدالت میں پہنچا۔ انھوں نے ہمیں بہت شرمندہ کیا کہ اپنے گھر آئے مہمانوں سے لڑنا ان کے ملک کو بُرا کہنا یہ تو نہایت بدتمیزی ہے۔ تہذیب کا تقاضا تو یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے ملک کی تعریف کریں، اسے سراہیں اور دوسرے ملکوں کے لیے ہمارا یہی رویہ ہے بھی مگر ہندوستانی، پاکستانی ہمیشہ اس کے برعکس برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ ہم تو خیر

شرمندہ ہوئے ہی مگر فریق مخالف پر بھی اس کا اچھا اثر ہوا۔

جامعہ اور علی گڑھ سے باہر نکلے تو اپنے غیر مسلم دوستوں اور ساتھیوں سے یہ سننا پڑا تمھارا پاکستان، انھیں یہ سمجھانا پڑا، کبھی بحث کر کے کبھی لڑ جھگڑ کے کبھی ہنس کے کہ ''بھئی جب ہم ہندوستان میں رہتے ہیں تو پاکستان ہمارا کیسے ہوسکتا ہے؟'' اور پھر پاکستان سے دو مرتبہ لڑ بیٹھے اور اس زمانے میں بھی ہر گھر میں ایک مورچہ قائم تھا۔ مگر پھر حالات بدلے۔ بڑی تعداد میں لوگ اِدھر سے اُدھر جانے لگے۔ پاکستانی فنکاروں کو سراہا جانے لگا۔ ادیب، موسیقار، مصوّر آئے اور انھیں آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ ''پاکستانی ادب نمبر'' نکلنے لگے۔ ادیبوں پر گوشے نکلنے شروع ہو گئے۔ پہلے دہلی کلاتھ مل کے مشاعرے میں ایک آدھ پاکستانی شاعر آجاتا تو سب بہت خوش ہوتے مگر اب ایسے سیمی نار اور کانفرنسیں ہونے لگیں جن میں پاکستانی شعرا، ادیب اور نقاد آنے لگے۔ وہ آتے تو دہلی مگر پھر ادھر اُدھر بھی جاتے ہر جگہ ان کا شاندار استقبال ہوا۔ پھر بعض ہندوستانی نقادوں نے یہ فتوے دینے شروع کر دیے کہ یہ فلاں پاکستان افسانہ نگار کا عہد ہے۔ یہ صدی فلاں سے منسوب ہے، فلاں صنف تو صرف پاکستان میں لکھی جارہی ہے اور کچھ لوگوں کو تو پاکستانومینیا ہو گیا۔ انھوں نے پاکستانی ادب اور بعض ادیبوں کو ہندوستان میں مشہور کرنے کا بیڑا اُٹھالیا اور کبھی اس جوش میں ایک آدھ پاکستانی شاعر کی وفات کی تاریخ اور تعزیتی مضمون بھی شائع ہو گیا۔ جب کہ خدا کے فضل سے وہ بقید حیات ہیں۔ ہندوستانی ادیبوں اور دانشوروں نے بھی پاکستان جانا شروع کیا، کچھ بلائے گئے کچھ بن بلائے، وہاں ان کے اعزاز میں جلسے ہوئے انٹرویو لیے گئے، یہاں تک کہ سمجھا جانے لگا کہ پاکستان جانے کا مقصد صرف 'ادبی' ہی ہوسکتا ہے۔ اسی لیے ہم جیسے 'چھٹ بھیئے' بھی اگر پاکستان جائیں تو یہ سوالات کیے جاتے ہیں۔

''کیا کسی سیمی نار میں جارہے ہیں؟''

''یہ ادبی سفر ہے۔''

''کن کن ادیبوں سے ملنے کا ارادہ ہے۔ ہمارا ان سے سلام کہیے گا۔''

ہم سب سے پہلے ۱۹۷۶ء میں پاکستان گئے تھے جب نئی نئی 'سمجھوتہ ایکسپریس' چلی تھی۔ جانے کا واحد مقصد اپنی باجی کو یہ خوشی دینا تھی کہ ان کا کوئی بھائی بہن ان سے ملنے ان کے گھر آیا ہے۔ امرتسر سے اٹاری والی گاڑی پر بیٹھے تو مسافر کافی کم تھے، جو تھے ان میں زیادہ تر تعداد بوڑھی خواتین اور حضرات کی تھی۔ چند نوجوان بھی تھے۔ بوڑھی خواتین جس طرح بلک بلک کر رو رہی تھیں، جو وہ کہہ رہی تھی۔ اُس کو سُن کر، اس کو دیکھ کر قرۃ العین حیدر کی تحریریں یاد آگئیں اور اس دن یہ سمجھ میں آیا کہ تقسیم ہند واقعی ایک المیہ ہے۔

گیارہ دن اسلام آباد اور دو دن لاہور رہ کر ہم آگئے۔ اسلام آباد بہت خوبصورت شہر ہے۔ لاہور ایسا ہے جیسے

ہندوستان کا کوئی شہر ہے۔ راولپنڈی، جموں جیسا لگتا ہے۔ دونوں طرف کسٹم پر مسافروں پر بہت تنگ کیا جاتا ہے۔ ’فلیٹ‘ سستی ملتی ہے۔ پاکستانی ٹی وی پر بہت اچھے پروگرام ہوتے ہیں۔ کشور ناہید بہت اچھی فیمنسٹ شاعری کر رہی ہیں۔ مہدی حسن بہت اچھی غزلیں گاتے ہیں۔ ریشما کو ٹی وی پر سُنا اس کے ریکارڈ ساتھ لائے۔ صادقین کی خطاطی دیکھی۔ اس دفتر کو دیکھا جس میں فیض بیٹھا کرتے تھے اور بس۔

دوسری دفعہ ممانی جان کے ساتھ پاکستان گئے۔ وہ زیادہ تر لاہور رہیں، ہم اسلام آباد، کل ملا کر ہم لوگ بائیس دن پاکستان رہے۔ اب کے کچھ ادیبوں سے ملاقاتیں ہوئیں، لاہور میں الطاف فاطمہ، اسلام آباد میں ممتاز مفتی، رشید امجد، منصور قیصر، رخسانہ صولت، منشاء الرحمن، اختر جمال اور ان کے شوہر احسان صاحب۔ اقبال ہال میں حلقۂ اربابِ ذوق کے جلسے میں کچھ کہانیاں اور نظمیں سُنیں اور اپنی کہانی سُنائی۔ ممانی جان اسلام آباد اور لاہور، کچھ اور ادبی محفلوں میں گئیں اور ہم وہاں جانے کے بجائے مری چلے گئے جو اسلام آباد سے بہت قریب ہے۔ تقریباً دو گھنٹے کا راستہ ہے۔ مری ہمیں مسوری سے بہت مشابہہ لگا۔ وہاں دن بھر گزارا، حالانکہ وہ دن بہت گرم تھا، بادل کا آسمان پر نام ونشان نہ تھا۔ مگر بس گھومتے ہی رہے۔ بائیس دن پاکستان رہ کر واپس آئے تو کشور ناہید کی کتاب ’دھوپ گلیاں اور دروازے‘ ساتھ تھی۔ فیض کا نیا مجموعۂ کلام اور استاد امانت کا کیسٹ بھی جس میں ابن انشا کی وہ غزل بھی تھی ’انشا جی اٹھو اب کوچ کرو‘۔

اس کے بعد ہم نے پہلے انگلستان، پھر ایک سال کے وقفے سے انگلستان، کینڈا اور امریکا کا سفر کر ڈالا۔ اور سفر نامے تصنیف کیے جنھیں لوگوں نے پسند کیا۔ پہلا سفر نامہ ’لندن تو ہم نے خوشامد کر کے ’کتاب نما‘ میں چھپوایا مگر دوسرے سفر نامے کو ’کتاب نما‘ نے اصرار سے چھاپا۔ یہ سفر نامے ہماری ادبی شناخت کا وسیلہ بنے اور ایک مشہور طنز و مزاح نگار نے ان کو لے کر ہمارا خاکہ اُڑا ڈالا۔ اب لوگ ملتے ہیں تو کہتے ہیں، ’’آپ کے سفر نامے پڑھے، پسند آئے۔ آپ اور بھی کچھ لکھیے۔‘‘ دو دفعہ پاکستان گئے مگر وہاں کا سفر نامہ لکھنے کا خیال ہی نہیں آیا۔ نہ ہمارا اس ملک سے کوئی جذباتی تعلق تھا نہ کوئی ماضی کا رشتہ تھا کہ ہم ’اس‘ طرح کی باتیں لکھتے اور نہ ادبی وسیاسی فتوحات تھیں، نہ ادیبوں سے ملاقاتیں جس کے تاثرات لکھتے۔

ہندوستان، پاکستان تو ہمیں ایسے لگتے ہیں جیسے ایک بہت بڑے گھر میں رہنے والے دو بھائیوں نے لوگوں کے بہکانے اور کہنے سننے میں آ کر بٹوارا کر لیا ہے اور ایک لمبی اور اونچی دیوار کھڑی کر لی مگر دونوں دیوار کے اِدھر اُدھر ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے ذرا بھی غافل نہیں ہوتے۔ چھیڑ چھاڑ چلی جاتی ہے، کبھی گالی گفتار کبھی ملّاحیاں، آنا جانا بھی، روٹھنا اور منا، طنز وطعن اور بدگمانیاں اور صفائیاں بھی۔ اللہ بھلا کرے بھڑکانے والوں کا کہ وہ بی جمالو پن سے باز نہیں آتے اور اب بٹوارے کو اتنے دن ہو گئے ہیں، دیوار اتنی اونچی اور مضبوط ہے کہ اب اس گھر کے آدھے حصّے کا شمار پڑوس

میں ہونے لگا ہے۔تو اب بھلا ہم پاکستان کا سفرنامہ لکھیں تو کیسے۔

مگر اب صورتِ حال یہ ہے کہ اپنی گزران ہی سفرناموں پر ہے اگر یہ نہ لکھیں تو ادبی دنیا میں ہمارا وجود کیسے باقی رہے گا؟ اور وہ رہنا بہت ضروری ہے۔تو یہ سفرنامہ ہماری مجبوری ہے۔

اس دفعہ بھی پاکستان جانے کا سبب ہماری باجی ہی تھیں جوان دنوں بہت بیمار ہیں۔ان کو شادی کے بعد سے کبھی یہ خوشی نصیب نہیں ہوئی کہ کوئی عزیز ان کی کسی بیماری دکھی میں ان کا دکھ بٹائے۔اس لیے نامساعد حالات کے باوجود ہم نے پاکستان جانے کا ارادہ کرلیا۔

''ریل سے سفر کرنا آج کل بہت مخدوش ہے۔'' ہم نے ممانی جان (بیگم صالحہ عابد حسین) کی اس بات کو اس لیے مان لیا کہ ہوائی جہاز سے آرام سے جائیں گے اور اس کے کرایے کا انتظام ممانی جان کے سر رہے گا۔بھئی ہماری حیثیت تو ریل سے سفر کی ہے۔اب آپ جیسا کہیں۔شاہد علی خاں (مکتبہ جامعہ کے جنرل مینیجر) سے رجوع کیا گیا۔ انھوں نے ہم تینوں کی رائلٹی کی کچھ رقم عنایت کی یہ کہہ کر''ضرور تمھیں سفر درپیش ہوگا۔اور سفرنامہ تصنیف کرنا ہوگا۔'' مگر اب ممانی جان شش و پنج میں تھیں کہ رمضان کا مہینہ تھا اوران کو زکات و خیرات دینا تھی۔ہم نے ان سے کہا ہمیں بھی اس زمرے میں رکھ لیں تو بولیں''تاکہ تم زکات خیرات لے کر ہوائی جہاز میں اُڑتی پھرو۔'' ہمارے ایک صاحب حیثیت دوست نے جو یہ سُنا کہ ہم سفر پر جارہے ہیں تو انھوں نے ہمیں دہلی سے لاہور اور لاہور سے دہلی تک ٹکٹ کی رقم یہ کہہ کر دی کہ اس قرضے کا ذکر سفرنامے میں نہیں ہوگا۔اس لیے ہم ان کا ذکر نہیں کررہے۔

اب سوال پیدا ہوا ویزا کا''ویزا فارم؟ وہ کیا مشکل ہیں مل جائیں گے۔ویزا فارم لیجیے کل ہی آجائیں گے۔ آپ کو ویزا فارم چاہئیں، ہم لا دیں گے۔'' مختلف لوگوں نے مختلف وقتوں میں ہم سے وعدہ کیے مگر اسی طرح ہفتوں گزر گئے۔ایک دن ہم نے پاکستان ایمبسی فون کر کے معلومات حاصل کرنی چاہیں تو ہمیں ویزا اسیکشن دے دیا گیا، وہاں ایک مردِ معقول نے سلام علیکم جی کہہ کر اتنی نرمی اور آسانی سے بات کی، ہم بھونچکے رہ گئے۔وہ بولے آپ بلکل تکلیف نہ کریں، فارم مل جائیں گے۔ ہمارے ایک کولیگ آپ کے قریب ہی رہتے ہیں۔ہم نے گھگھیا کر کہا،''نہیں جناب، آپ ہمیں ان کا پتہ بتا دیں ہم خود ان سے لے لیں گے۔'' انھوں نے فوراً پتا بتا دیا۔

شام کو جو ہم وقت مقررہ پر اس پتے پر پہنچے تو ان حضرت کے گھر کی خواتین کو ہم پر نہ جانے کیا گمان گزرا، نہ انھوں نے ہماری کچھ سنی نہ اپنی ہمیں سننے دی۔دروازے پر اس طرح آکر کھڑی ہوگئیں کہ ہم زبردستی ان کے گھر میں داخل ہونے کی کوشش نہ کریں۔ہم نہایت بدمزہ ہوئے اور وہ خوشگوار احساس جو ٹیلی فون سن کر ہوا تھا اور یہ خیال کہ برصغیر میں اس طرح بھی کام ہو سکتے ہیں سخت کوفت میں تبدیل ہوگیا۔اور اس کے دوسرے دن سے ان لوگوں نے باری باری

فارم لازم لانے کی شروع کر دیے جنھوں نے وعدہ کیا تھا۔ فارم آئے اور ہمارے بہنوئی سبط اصغر کی مہربانی اور ممانی جان کی سفارش پر دن کے دن ہمیں ایمرجنسی ویزا مل گیا۔

چوبیس جون کو ہمارا جانا ٹھہرا۔ اب یہ فکر ہوئی کہ اسلام آباد فون پر اپنی آمد کی اطلاع دیں تا کہ کوئی لاہور آ کر ہمیں ریسو کرنے اور اسلام آباد پہنچانے میں مدد کرے۔ سو فون کی کوشش شروع ہوئی۔ بیس کو ہمارا ٹکٹ آیا تھا اسی رات ہم نے کال بک کرادی۔ اسلام آباد کی لائن خراب ہے۔ ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی۔ بھئی کیا کریں میڈم آپریٹر آن نہیں کر رہا ہے۔ لائن ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی۔ ہمیں کیا معلوم۔ ہاں ہاں۔ ہمیں معلوم ہے عید کی مبارکباد دینی ہوگی۔ ٹھیک ہے تو مگر ہم کیا کریں۔ یہ سب سنتے سنتے کان پک گئے۔ خوشامد، بحث ومباحثہ، ہنسی مذاق، لڑائی جھگڑا۔ مگر کال نہ ملنا تھی نہ ملی مگر ہم نے اسے کینسل نہیں کرایا کہ جب یہ ملے گی ہم اپنے اسلام آباد پہنچنے کی اطلاع دے دیں گے۔ یا پھر اسی کال سے پندرہ دن بعد اسلام آباد والوں کو اپنے دہلی پہنچنے کی اطلاع دے دیں گے۔ یہی سب اسلام آباد میں بھی ہوا مگر وہاں سے پانچ دن کی کوشش کے بعد دہلی کے لیے کال مل گئی۔

ممانی جان کے اصرار پر ہمارے بھائی رضا مہدی جو ایک نہایت مصروف شخص ہیں، اس پر آمادہ ہوئے کہ وہ ہمارے لیے اپنے آفس کی گاڑی لائیں گے اور خود رخصت کریں گے مگر ہم اس آفر سے سراسیمہ تھے کہ جانتے تھے کہ رضا کبھی کہیں وقت پر نہیں پہنچتے۔ سو وہی ہوا جب فلائٹ کے جانے میں صرف ڈیڑھ گھنٹہ رہ گیا تو وہ آئے ایک مریض تھری ویلر کے ساتھ جس نے پون گھنٹے میں ائیرپورٹ پہنچایا۔ ہم ان سے ملے بغیر ہی اندر گھسے اور سب مراحل طے کرنے میں لگ گئے۔ اس بھاگ دوڑ اور بار بار چیکنگ کے بعد ہم انڈین ائیر لائن کے جہاز میں تھے۔ لوگ بہت زیادہ نہیں تھے۔ جوس پیا، اخباروں کی سُرخیاں دیکھیں۔ لیجیے لاہور آنے لگا۔ ہم نے خود کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ ہم دوسرے ملک میں لینڈ کریں گے اپنی گھڑی کو آدھ گھنٹے پیچھے کرلیا۔ ہندوستانی مسافر بہت ہی کم تھے۔ اس لیے جلدی ہی ہمارا سامان کسٹم کاؤنٹر پر پہنچ گیا۔ ہم نے اپنے سوٹ کیس کا تالا کھولنا چاہا مگر نہیں کھلا۔ ہم نے پاس کھڑے ایک کسٹم آفیسر کو جو شلوار قمیص میں ملبوس تھے متوجہ کیا، یہ تالا نہیں کھل رہا ہے۔'' وہ بچارے تالا کھولنے کی کوشش کرنے لگے اور ہم نے لوگوں سے پوچھنا شروع کیا، ''ہم یہاں سے اسلام آباد کیسے جائیں؟''

''جی یہ چابی اس تالے کی نہیں ہے۔''

''ہم فلائٹ لیں یہاں سے تو۔''

''بی بی سنیے تو، یہ تالا نہیں کھل رہا ہے، یہ غلط چابی ہے۔ اس کی چابی دیجیے۔''

''ہمارے پاس اب کوئی چابی نہیں ہے۔ ہاں تو بھائی صاحب ہمارے پاس تو ٹریولر چیک ہے۔

''وہ تو یہاں بینک سے کیش ہو جائے گا مگر آپ سامان تو کھلوائیے۔'' ان بچارے کسٹم آفیسر کی آواز میں خاصی جھنجلاہٹ تھی۔

'' کیسے کھلوائیں؟'' ہم نے اُلٹا اُن سے سوال کر دیا۔ تالا توڑ دو پاس کھڑے ایک چپراسی قسم کے حضرت نے مشورہ دیا۔ اب نہ معلوم وہ کون تھے۔ وہاں سبھی تو شلوار قمیص میں ملبوس ہوتے ہیں۔

''صاحب آپ تالا توڑیں یا سامان رکھ لیں مگر ہمیں اسلام آباد جانے دیجیے۔'' پاس کھڑے ایک معمر حضرت جو دیر سے کھڑے یہ مکالمے سن رہے تھے بولے، ''بی بی سامان کو دکھائے بغیر آپ کیسے جائیں گی۔''

''تو دیکھیے سامان ہم منع کر رہے ہیں۔ اب ہم کیا کریں۔'' اور اس دوران تالا توڑنے کے لیے کسی چیز کی تلاش شروع ہو گئی۔

غالباً ہمارے چہرے پر کسی قسم کی پریشانی کے آثار نہ دیکھ کر ایک سفید پتلون بشرٹ پوش حضرت آئے، مسکرائے اور بولے، ''نہیں رہنے دو تالا مت توڑو۔ جائیے آپ اسلام آباد جائیے۔ مگر سنیے کیا آپ رائٹر ہیں۔''

''جی کیا آپ کے ملک میں یہ بھی کوئی جرم ہے؟''

''جی نہیں، سوٹ کیس کی چابی گھر بھول آنا بھی جرم نہیں ہے، بی بی ہمارے ملک میں۔ اچھا اپنی کوئی کتاب لائی ہیں اپنے ساتھ۔''

''کتاب؟ یہاں ہماری کتاب کوئی پڑھتا ہی نہیں۔''

''مگر اس میں کچھ کتابیں تو ہیں۔'' انھوں نے ہمارے پاس جو بیگ تھا اس کے وزن کو تول لیا تھا۔

''ہاں ہے مگر اس میں ہماری کتاب، ہاں ایک ہے۔'' اور پھر انھوں نے وہ کتاب ہاتھ میں لی، اس کو ادھر اُدھر سے دیکھا، پھر کتاب ہمیں واپس کر کے پاس کھڑے ایک حضرت سے کہا بی بی کا سامان بینک تک پہنچاؤ۔''

بینک میں ۵۰ ڈالر کے سات سو پچاس روپے لے کر ہم نہایت مسرور ہوئے اور باہر نکلے تو پشاوری حضرت نے ہمارا سوٹ کیس ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہم پیچھے دوڑے تھوڑی دیر میں ہم اور سوٹ کیس دونوں ٹیکسی میں تھے۔ انھوں نے ہم سے پانچ روپے وصول کیے اور ٹیکسی چل دی۔ پھر پانچ روپے اور ٹیکسی دور چل کر رک گئی اور ڈرائیور صاحب جو خاصے نوجوان تھے، ایک پیدل جاتے ہپی کو روک کر کچھ کہنے لگے۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ ان کو پٹا رہے ہیں۔ ہم فوراً ٹیکسی سے اُترے اور ان سے کہا، ''جناب یہ ٹیکسی ہم نے لی ہے۔'' وہ گھبرا گئے۔ جلدی سے آئے، بولے چلیے چلیے۔ پھر ٹیکسی میں بیٹھ کر کہنے لگے ان کو بٹھاتے تو ان سے کچھ مل جاتا۔ ۸۰ روپے آپ دیں گی؟''

''جی ۸۰ روپے؟ کوچ اسٹیشن تک کے؟''

''ہاں بہت دور ہے۔''

''جی ہے ہمیں یہ معلوم ہے کہ زیادہ سے زیادہ ۳۰ روپے لگتے ہیں۔ یہ بھی چھوڑیے جتنے بھی میٹر میں ہوں گے دیں گے۔''

''یہاں میٹر نہیں چلتا۔''

''پھر یہاں کیا چلتا ہے؟''

''بس ٹھہرا لیتے ہیں۔''

''جناب ہم تو ۳۰ روپے سے ایک پیسا زیادہ نہیں دیں گے۔''

''تو پھر اُتر جایئے۔'' اور پھر وہ ہمیں اُترنے پر آمادہ دیکھ کر بولے،'' آپ انڈیا سے آئی ہیں؟''

''ہم انڈیا سے آئے ہوں یا ٹمبکٹو سے مگر ۸۰ روپے تمھیں نہیں دیں گے۔''

''چلیے بیٹھیے۔ آپ شاید پاکستان آتی رہتی ہیں۔ آپا جان آپ سید ہیں کہ آپ کے بازو پر امام ضامن بندھا ہے۔ آپ کا یہ بھائی بھی سید ہے۔ آپ کے کئی بھتیجے، بھتیجیاں ہیں۔ آپا جان پاکستان میں بہت مہنگائی ہے۔ کیا انڈیا بھی اتنا ہی مہنگا ہے۔ پھر پاکستان، ہندوستان کے اقتصادی مسائل ہمارے ان کے درمیان زیر بحث رہے۔ وہ یہ اصرار کرتے رہے کہ آپ کچھ ٹھنڈا پی لیجیے۔ انھوں نے ہمارے بہت سے خط پوسٹ کیے۔ کوچ اسٹیشن پر پہنچ کر کوچ کا ٹکٹ خریدا، سامان اُتار کر ویٹنگ روم میں رکھا اور سلام علیکم آپا جان کہہ کر رخصت ہونے لگے تو ہم نے ۵۰ روپے کا نوٹ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

لاہور پر ایک نظر ڈالی خاصی چہل پہل تھی۔ مگر غضب کی گرمی تھی۔ ہم ویٹنگ روم سے باہر نکلنے کو ہوئے تو ایک خاتون آگے بڑھیں اور پنکھا جھلنے لگیں۔ ہم نے شک گزار نظروں سے انھیں دیکھا۔ سوچا ویٹنگ روم سے متعلق کوئی خاتون ہوں گی۔ آگے بڑھے تو بولیں:

''باجی ایک روپیہ۔۔ بچہ بھوکا ہے۔'' ہم نے جلدی سے ان کو ایک روپیہ تھمایا اور بڑھے تو کئی اور خواتین پنکھے لیے آگئے بڑھیں اور جھل جھل کر پیسے مانگنے لگیں۔ ان سے پیچھے چھڑا کر ایک دکان پر گئے کہ کچھ ٹھنڈا پئیں تو کئی اور خواتین نے پنکھوں سمیت ہمیں گھیر لیا۔ ہم نے دکاندار سے پوچھا،'' یہ لوگ پنکھا کیوں جھل رہی ہیں؟'' بولے،'' پیسے مانگنے کے لیے۔'' ہمیں ان کے پیسے مانگنے کا یہ انداز بہت بھایا۔

فلائنگ کوچ بہت اچھی نکلی۔ بمشکل سولہ سترہ مسافر تھے۔ بہت آرام دہ سیٹیں ہوائی جہاز جیسی۔ ایئر کنڈیشنڈ اور پھر مسلسل ہندوستانی گانوں سے انٹرٹینمنٹ، کرایہ صرف ۵۰ روپے۔ ہم نے لاہور میں پانچ روپے کا 'اخبارِ جہاں' خریدا

تھا اسے دیکھنے لگے اور دیکھتے دیکھتے اونگھ گئے۔ آنکھ کھلی تو ایک بوڑھے حضرت کہہ رہے تھے، ''ارے بھئی گاڑی روکو عصر کا وقت ہے۔'' اور گانا ہو رہا تھا، ''میں ہوں پریم روگی کوئی وید کو بلاؤ'' ہم تیار ہوئے کہ نماز پڑھیں مگر معلوم ہوا کہ کوچ سے اُتر کر صرف پانچ لوگ مسجد کی طرف روانہ ہوئے، باقی لوگ دکانوں پر کھڑے ہو کر کھانے پینے لگے۔ ہم نے بھی اکثریت کا ساتھ دیا۔ ویسے پاکستان میں نماز پڑھنے کی اتنی اچھی اچھی جگہیں ہیں، خاص طور پر ائیر پورٹ پر کیا نرم نرم موٹے قالین، کیا خوبصورت جائے نماز ہیں کہ بے اختیار نماز پڑھنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔

مغرب کے وقت بھی کوچ رکی تو نماز پڑھنے والوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا اور اس مرتبہ ہم کوچ ہی میں بیٹھے رہے۔ پھر کوچ چلی تو وہی حضرت مجھ سے میرے بارے میں طرح طرح کے سوال کرنے لگے جو بار بار نماز کے لیے گاڑی رکوا رہے تھے۔ پھر بولے، ''یہ ڈرائیور کس قدر چالاک ہے، ائیر کنڈیشنڈ تھوڑی دیر بعد بند کر دیتا ہے۔'' پھر تو وہ ہر پندرہ منٹ بعد ایک ہانک لگاتے، ''ارے ائیر کنڈیشنڈ کھولو۔'' جہلم پر کھانے کے لیے ۸ بجے پھر کوچ رکی۔ لوگوں نے مرغے اور کباب اُڑائے اور ہم نے ۱۰ روپے میں دو پیالی چائے اور کیک کا ایک ٹکڑا لیا۔

رات کو گیارہ بجے راولپنڈی لیاقت آباد کوچ اسٹیشن پر ہم پہنچے تو خاصی چہل پہل تھی، فوراً ٹیکسی مل گئی اور اسلام آباد روانہ ہو گئے۔ ۱۹۷۶ء میں بھی ہم یوں ہی اسلام آباد پہنچے تھے۔ اس دفعہ جو ڈرائیور صاحب تھے وہ پشاوری تھے اور راستے بھر ہمیں خوفناک قصے سنا سنا کر ڈراتے رہے۔ مگر یہ ڈرائیور صاحب بلکل خاموش تھے۔ وہ سنسان علاقہ بھی اب آباد ہو گیا تھا۔ خیابان سرسید سے اسلام آباد کی مخصوص گیرنری اور ایک خاص قسم کی مہک آنی شروع ہو گئی۔ روز گارڈن اور پھر آب پارہ۔ ایک فوجی اور ایک سویلین کی مدد سے ہم ۶/۴ جی پر پہنچ گئے۔ ہمیں دیکھ کر سب دنگ، خوش اور باجی گریہ کناں، خوشی سے بلکہ فرطِ خوشی سے۔

صبح 'جنگ' پڑھا تو معلوم ہوا کہ پاکستانی قلم کاروں کی کانفرنس اسلام آباد ہوٹل میں ہو رہی ہے جو ہمارے بہت قریب تھا۔ اور صدر ضیا اس کا افتتاح کر رہے تھے۔ مشہور مزاح نگار شفیق الرحمن اس کے کرتا دھرتا تھے۔ ہمارے بھانجے نصرت عباس نے اپنے ذرائع استعمال کر کے ہمارے لیے دعوت نامہ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر معلوم ہوا کہ سیکورٹی کے اقدامات سخت ہیں۔ 'I' کارڈ دکھانا ہوتا ہے، پہلے سے نام فہرست میں نہیں ہے مگر ہم نے ٹیلی ویژن کے وسیلے سے اس کانفرنس میں شرکت کر لی گھر بیٹھے۔ پاکستان کے ادیبوں اور نقادوں کو دیکھا۔

احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، جمیل جالبی، جمیل الدین عالی اور شفیق الرحمن، جن کی چیزیں لڑکپن سے پڑھتے آئے تھے، جن کے کرداروں، شیطان، روفی اور حکومت آپا سے گہری شناسائی تھی۔ ادیبوں کو انعام لیتے بھی دیکھا۔ سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا۔ یعنی ڈیوک کناٹ یعنی جنرل ضیا الحق کو دیکھا بلکہ سنا۔ انھوں نے 'پڑوس' کا بھی ذکر کیا۔ پڑوسی

ادیبوں کا، پروفیسر گوپی چند نارنگ کا ذکر نام لے کر کیا۔ ہم اپنے حسابوں میں یہ خبر لے کر ہندوستان آئے اور نارنگ صاحب کو یہ خبر پہنچائی تو معلوم ہوا وہ اس سے مطلع ہو چکے ہیں۔ لوگ خطوں اور فون سے یہ اطلاع ان کو دے چکے ہیں۔

''بھارت ہند مذاکرات'' بھی اسی دوران ہوئے اور اس میں ہونے والے سمجھوتے پر اظہار مسرت بھی۔

اسلام آباد زیادہ آباد ہو گیا ہے۔ اب اتنا صاف ستھرا بھی نہیں رہا۔ پھر بھی کافی ستھرا اور نسبتاً پُرسکون ہے۔ ان دنوں وہاں گرمی بہت پڑ رہی تھی مگر نہ اتنی جتنی دہلی میں تھی۔ مگر لوگ گرمی اور اس سے زیادہ بارش نہ ہونے سے پریشان تھے۔ چنانچہ ہمارے سامنے بعد نماز جمعہ بارش کے لیے نماز پڑھی گئی اور صدر ضیا کو نماز پڑھتے دکھایا گیا اور وزیر اعظم جنیجو کو بھی۔ رات کو آسمان صاف تھا مگر اس یقین پر خدا ضرور اپنے بندوں کی دعا سنے گا۔ ہم لوگوں نے صبح صبح شکر پڑیاں اور روز گارڈن جانے کا پروگرام بنالیا۔

صبح اٹھے تو واقعی گہرا بادل تھا۔ جلدی جلدی تیار ہوئے اور چل دیے۔ پہلے روز گارڈن گئے جو کافی اُجڑا ہوا تھا، لان بھی پیلے ہو رہے تھے۔ فوارے خشک پڑے تھے کچھ لوگ ورزش کر رہے تھے۔ کچھ محوِ خواب تھے۔ وہاں ہم ٹہل ہی رہے تھے کہ بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اللہ میاں بھی کیسے کیسے اپنے بندوں کا بھرم رکھتا ہے! شکر پڑیاں پہنچے تو بارش تیز ہو گئی تھی۔ یہاں کئی نئے ریستوراں بن گئے تھے۔ شادابی بھی تھی ایک بند ریستوراں کو کھلوا کر کھڑکیوں سے بارش کا نظارہ کرتے رہے، ہرے ہرے پیڑ اور اس کے عقب میں اونچی اونچی عمارتیں۔

اب کی ہم نے اسلام آباد یونی ورسٹی بھی دیکھی، آبادی سے دور ذرا بلندی پر سبزے سے بھری بہت پُرفضا جگہ پر ہے مجھے اس کا کیمپس دیکھ کر بفلو یونی ورسٹی کا خیال آ گیا۔ باجی کے بچوں کا خیال تھا کہ ایک ویک اینڈ پر ٹیکسلا جائیں گے اور ایک دن کے لیے مری۔ مگر میں زیادہ تر باجی کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ پھر مری میں تو پانی کی شدید قلت تھی، جو لوگ مری گرمیاں گزارنے گئے تھے، وہ نہانے دھونے اسلام آباد آئے تھے۔ سیر کو جاتے تو رہبر وارٹر کولر ساتھ ہوتا۔ جب پانی ساتھ دیتا تو رہتے پھر چلے آتے۔ مری سے فون آتا لوگ اپنے دوستوں کو فون کرتے مری آؤ مگر پانی ساتھ لانا۔

ہمارے بارے میں لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ ہم تارکِ صوم وصلات ہیں، اس میں ہمارے گھر کے لوگ شامل ہیں۔ شاید اس لیے کہ ہم ہر جگہ جائے نماز بچھا کر نماز کو کھڑے ہو جانے کے قائل نہیں، نہ مجمع میں تلاوتِ قرآن کرنے کے۔ اسی لیے تو جب ہم نے اسلام آباد میں نماز پڑھی تو لوگوں نے اسے کچھ اور سمجھا۔ اور ہمارے بھانجے نصرت عباس نے ایک صبح نماز کے بعد پنج سورہ پڑھتے دیکھا تو بولے ''واہ رے جنرل صاحب کیسے کیسے لوگوں کے ہاتھ میں پنج سورہ تھما دیا''۔ اس ضمن میں ایک اور دلچسپ بات۔ پاکستان میں ہر دوسرے نہیں تو تیسرے گھر میں وی سی آر ہے اور خوب لوگ ہندوستانی فلمیں دیکھتے ہیں۔ ''میں تلسی تیرے آنگن کی''، ''ارجن'' اور ''قلی''، ''شیو کا انصاف'' لمبو یعنی امیتابھ بچن

وہاں نوجوان لڑکیوں کے علاوہ چھوٹے بچوں کا محبوب ہیرو ہے۔ ایک ہماری بزرگ خاتون نے مجھے یہ بہت دکھ سے بتایا کہ ان کے پوتے کل پتنگ اُڑا رہے تھے تو ایک نے دوسرے سے کہا بھیا چھوڑ دو بھگوان کا نام لے کر۔ اور جے شوشنکر گاتے ہیں! بقول نصرت عباس آپ لوگ کس کس طرح ہم پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔

باجی کا گھر تعمیر ہو رہا تھا۔ آبادی سے بہت دور، اتنی دور کہ جہاں ویگن جاتی ہے نہ بس۔ بچیاں، بچے، قمر بھائی، نہایت خوش تھے۔ بچیاں تو اس لیے کہ وہ اپنی پسند کا پانچ بیڈروم کا گھر بنوا رہی تھیں، جسے وہ اپنی پسند سے سجائیں گی، اپنی پسند کا فرنیچر خریدیں گی۔ ٹی وی لاونج ہوگا (جو پاکستان میں تقریباً ہر گھر میں ہوتا ہے) لائبریری ہوگی (جس کا رواج بہت کم ہے) باجی اس سے بہت خفا ہیں کہ امام باڑہ دور ہو جائے گا۔ گھر نئی وضع کا بنوایا جا رہا ہے۔ بقول ان کے سنگِ مرمر کا قید خانہ جس میں نہ کچّا آنگن ہوگا نہ برآمدہ۔ وہ اپنی چڑیوں، توتوں، میناؤں کا کہاں رکھیں گی۔ ہم نے تو بھئی گھر بہت پسند کیا۔ تعمیر کا کام رکا ہوا تھا کہ مزدور عید منانے اپنے اپنے گھروں کو گئے ہوئے تھے۔ وہاں عید کا شور ہفتوں رہتا ہے۔ جیسے ویسٹ میں کرسمس کا۔ ہم عید کے چار پانچ دن بعد پہنچے تھے مگر عید کی گہما گہمی ہر جگہ تھی۔ دکانوں پر راستوں میں، گھروں میں۔

ہم زیادہ تر گھر میں رہتے۔ شام کو کبھی کبھی نکلتے تو میلوڈی چلے جاتے یا پھر سُپر بازار، کبھی جناح سپر۔ پاکستان میں زیادہ تر ریستوراں سنسان پڑے رہتے ہیں۔ ہم انھیں کبھی کبھی آباد کرتے۔

ہم نے اخبار 'جنگ' اور اخبار 'خواتین' سے پاکستان کی سیاسی، ادبی اور ثقافتی خبریں معلوم کیں۔ رئیس امروہوی کے لکھے ہوئے کالم پڑھے۔ اور جمیل الدین عالی کا وہ کالم بھی جو انھوں نے اسلام آباد قلم کاروں کی کانفرنس سے کراچی لوٹنے پر لکھا تھا، جس میں اس واقعے کا دلدوز بیان تھا کہ لاہور کسٹم پر ڈاکٹر خلیق الزماں کو وہاں کے عملے نے نہیں پہچانا تھا۔ صدر ضیا اور وزیر اعظم جنیجو سے بہت طویل ملاقاتیں رہیں۔ ٹی وی کے وسیلے سے بہت اچھی قرأت سنی اور تفہیم قرآن کی محفل میں شرکت کی۔ ہماری واپسی کا وقت آیا تو نصرت عباس نے اسلام آباد سے لاہور تک کا ائیر ٹکٹ لا کر دیا بولے، ''یہ ہماری طرف سے، ہم نوکر جو ہو گئے ہیں۔ پھر صغرا خالہ مفت کے ٹکٹ پر سفر کرنے کا اور ہی مزہ ہے۔'' آنے سے پہلے والی شام ''دامن کوہ'' پر گزاری۔ کچھ خاصی بلندی پر ہے۔ موسم بھی خوشگوار تھا۔ وہاں سے اسلام آباد اور راولپنڈی کا نظارہ کیا۔ غروب آفتاب کا منظر دیکھا۔ بھانت بھانت کے لوگوں کو دیکھا اور چلے آئے۔

دس کو ۱۱ بجے دن کو اسلام آباد ائیر پورٹ کے لیے چلے، اور ۱۲ بجے وہاں سے لاہور۔ وہی پچاس منٹ کی فلائٹ۔ چائے پینے، اخبار پڑھنے اور ہوائی جہاز کا جائزہ لینے ہی میں وقت گزر گیا اور جب ہم لاہور میں انڈین ائیر لائنز کی فلائٹ کا انتظار کر رہے تھے تو ایک بنگلہ دیشی حضرت مل گئے جو دہلی کے بارے میں معلومات کرتے رہے کہ انھیں ایک

رات یہاں رکنا تھا۔

کسٹم پر ہمارا سوٹ کیس پھرنہیں کھلا کہ ہم نے یہ اعلان کر دیا کہ'' بھئی آپ اسے کھولیے ضرور مگر بند بھی کرنا ہوگا۔ہم سے تو بند ہوگا نہیں ۔'' بہت انتظار اور بار بار پیکنگ کے بعد ہم جہاز پر چڑھے اور اپنی جگہ لی۔ موسم بہت خراب تھا۔ ہوائی جہاز بادلوں میں تیر رہا تھا بلکہ ہچکولے کھا رہا تھا۔ ہمارے پاس بیٹھی ایک لڑکی جو چھ مہینے پہلے ہندوستانی تھی اب وہاں شادی کے بعد پاکستانی ہونے والی تھی۔ ہندوستان آنے کے خیال سے بہت خوش۔ دہلی آنے کا اعلان ہوا تو وہ خوش ہوکر بولی،'' آ گیا ہمارا دہلی، ہاں آ گیا ہمارا دہلی۔'' ہم اُترے تو ہمارے ساتھ نیرہ نور تھیں، عابدہ پروین تھیں، اقبال بانو اور فریدہ خانم تھیں۔ابن انشا اور مستنصر حسین تارڑ کے سفرنامے تھے۔منیر نیازی اور ناصر کاظمی کے دیوان تھے۔فیض کا دل من مسافر تھا۔ کسٹم میں دیر نہیں لگی۔ باہر نکلے۔اس فکر میں تھے کہ ٹیکسی لیں کہ بہت سے لوگوں میں ایک پیارا اور خوبصورت چہرہ نظر آیا جو ہمارے بھائی انور عباس کا تھا جو ہمیں لینے آئے تھے۔

آئے تو لوگوں نے سوال کیا ہماری ادبی مصروفیات کے بارے میں۔اس کے جواب میں ہمارے پاس شہزادہ منظر کا یہ خط تھا اور بس۔

'' یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ آپ پاکستان آئی ہوئی ہیں۔اس کے ساتھ یہ جان کر افسوس ہوا کہ کراچی نہیں آ رہی ہیں، ہم سوچ رہے تھے کہ آپ کراچی آئیں گی تو آپ کا شاندار استقبال کریں گے، ادیبوں سے آپ کو ملائیں گے۔اخبارات میں انٹرویو شائع ہوں گے۔آپ کے اعزاز میں نشستیں ہوں گی۔''

اس خط کو پڑھ کر ہمیں گمان ہوا کہ شاید ہم ادیب ہیں اور ہم پاکستان گئے تھے۔

☆☆☆

muntes.in

چلتے ہوتو موریشس چلیے

موریشس ایک انوکھا ملک ہے، بہت خوبصورت وحسین جزیرہ، وہاں کافی تعداد میں ہندنژادلوگ رہتے ہیں، وہاں اردو، ہندی بولی جاتی ہے، پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے۔ وہاں سے طالب علم علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور لکھنؤ اردو، ہندی پڑھنے آتے ہیں۔ ہندی شعبے کے کئی رفیق موریشس جا چکے ہیں۔ اطہر پرویز مرحوم جن کا تعلق مکتبہ جامعہ اور علی گڑھ سے تھا، وہاں اردو پڑھانے کے لیے ایک عرصے تک رہے تھے۔ ہماری ایک طالب علم یاسمین بودھی بھی ماریشس کی تھیں۔ جب وہ تعلیم ختم کر کے جانے لگیں انھوں نے ہمیں موریشس آنے کی پُرزور دعوت دی۔''آپ موریشس کو بہت پسند کریں گی ضرور کبھی آیئے۔''''ضرور'' ہم نے فوراً وعدہ کرلیا اور اب جن ملکوں کی سیر کا ارادہ ہے ان میں موریشس کا اضافہ بھی کرلیا ہے۔ وقت گزرتا رہا۔ یاسمین پچھلے سال ہندوستان آئیں اور انھوں نے موریشس آنے کا وعدہ لیا۔ ہم نے کہا،''ضرور جلد ہی آئیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے یقینا ہمارے لاشعور میں یہ بات ہوگی کہ خدا بڑا مسبّب الاسباب ہے۔ سونومبر کے مہینے میں یہ خبریں آنی شروع ہوئیں کہ موریشس میں عالمی اردو کانفرنس ہورہی ہے اور آئی، سی، سی، آر کی طرف سے ہندوستان سے ایک وفد جارہا ہے۔' کاش ہم بھی اس میں ہوتے۔' ہم نے دل میں سوچا۔ پھر تقریباً ایک مہینے تک یہ وفد اور اس میں جانے والے لوگوں کے نام نیوز میں رہے اور پھر دسمبر کی ۳۰ کو مسٹر باسو کے فون سے یہ مژدہ ملا کہ ہمارا نام بھی اس میں ہے۔ ہم نے جی بھر کے ان لوگوں کو دعائیں دیں جنھوں نے یہ کام کیا کہ آج کل لوگوں کو سب سے زیادہ اسی کی ضرورت ہے۔ سارے کام تو آئی، سی، سی، آر نے کردیے۔ پاسپورٹ ہمارا ہر دم تیار ہی رہتا ہے، بس فارن ایکسچینج لینے کے لیے تھامس کک کے یہاں جانا پڑا۔ وہاں رضا زیدی مشہور آرٹسٹ سے ملاقات ہوئی جو اپنی کیلی گرافی کی نمائش لے کر جارہے تھے۔ جامعہ میں ہی رہتے ہیں۔ ان سے ہم نے طے کرلیا کہ ائیر پورٹ ساتھ ہی چلیں گے اور شام کو پانچ بجے ہم پھر اندرا گاندھی ائیر پورٹ کی طرف رواں دواں تھے۔ ایک خوبصورت جزیرے کی طرف۔

ائیر پورٹ پر انیس احمد صاحب کیلی گرافر موجود تھے۔ پھر گلزار نقوی، جو آزاد بھون میں چیف لائبریرین ہیں، بھی وفد کے ساتھ کوآرڈی نیٹر کی حیثیت سے جارہے تھے۔ آئے لدے پھندے ایک بڑے سے کتابوں کے بنڈل کے

munotes.in

ساتھ۔معلوم ہوا کہ اشتیاق عابدی صاحب،سیکریٹری اردو اکادمی ،دہلی بھی آچکے ہیں۔ہم لوگ ائیر انڈیا کے کاؤنٹر پر کھڑے ہو گئے۔ائیر پورٹ پہنچ کرفوراً یہ جی چاہتا ہے کہ سامان کا بوجھ فوراً اترنا چاہیے۔اسی دوران ایک ایک کر کے اراکین وفد آنے شروع ہوئے۔فہمیدہ بیگم نپے تلے قدموں کے ساتھ،نہایت اعتماد اور وقار کے ساتھ۔

سید حامد اپنی مخصوص مسکراہٹ اور نیچی نظروں کے ساتھ مگر چہرے پر تشویش،ایک طرف الگ کھڑے ہو گئے۔ معلوم ہوا تشویش کا سبب خلیق انجم صاحب کا نہ ہونا ہے کہ ان کے سب کاغذات،پاسپورٹ وغیرہ ان ہی کے پاس تھے۔ تشویس بجا تھی۔

پھر ایک طرح دار خاتون سفید سلک کی ساڑی میں ملبوس،چہرے پر غضب کی طمانیت،ہاتھ میں وینیٹی بیگ بیگم حامدہ حبیب اللہ۔دل نے کہالطفِ سفر ہے ان ہی کے ساتھ۔پھر اخلاق اثر صاحب،حضرت بیکل اتسا ہی نورانی چہرے کے ساتھ مسکرا مسکرا کرسلاموں کا جواب دیتے۔فرسٹ کلاس کے کاؤنٹر پر ہمارا کام ختم ہو گیا کہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نظر آئے جنھیں دیکھ کرنہ جانے مولوی اسمٰعیل کا یہ شعر کیوں یاد آجاتا ہے۔

دھن کی پوری ہے بات کی پکی   نہر پر چل رہی ہے پن چکی

موریشس کے پورے سفر کے دوران ان کا یہی عالم رہا اور پھر پروفیسر گوپی چند نارنگ اس شان کے ساتھ،چلو موریشس بھی نمٹا دیں۔موصوف ابھی چین کے سفر سے واپس آئے تھے اور پھر آخر میں انجمن صاحب۔اور میرا مطلب ہے خلیق انجم صاحب،ساتھ میں پروفیسر وہاب اشرفی جو واقعی مسافروں والی کیفیت اپنے چہرے پر طاری کیے ہوئے تھے۔موصوف کو ہم بس پروفیسر ہی سمجھتے تھے۔سنجیدہ،بارعب اور ذرا بات کرتے جھجکتے تھے مگر موریشس کے سفر کے دوران معلوم ہوا کہ آپ میں احساسِ مزاح بھی ہے اور کبھی کبھی اس کو بروقت کام میں لاکر لوگوں کے بڑے مسئلے حل کر دیتے ہیں۔

ائیر انڈیا کی فلائٹ گیارہ بجے کے قریب بمبئی پہنچنے والی تھی اور موریشس کی فلائٹ تین بجے تھی سوچ رہے تھے کہ اتنی دیر کیا کریں گے۔مگر خدا نے ایسا انتظام کیا کہ بجائے اس کے کہ ہم فلائٹ کا انتظار کرتے،فلائٹ کو ہمارا انتظار کرنا پڑا۔ہوا یوں کہ ائیر انڈیا پر بیٹھ کر تین گھنٹے بعد راز کھلا کہ جہاز میں خرابی ہے اور سب مسافر نیچے اُترے اور پھر بھاگ دوڑ،کوفت پریشانی۔پھر ارکان ائیر انڈیا کی کارکردگی۔ائیر موریشس کو روکنے کی ہدایت،غیر ملکی سفر کی سب کارروائی دہلی میں۔ایک بجے پھر ائیر انڈیا پر سب کا سوار ہونا۔سوتے جاگتے دہلی سے بمبئی کا سفر۔بمبئی پہنچ کر فوراً ائیر موریشس میں اور ولی محمد شاہین جو کینیڈا سے آئے تھے،پروفیسر شمیم حنفی،ابوالکلام قاسمی بھی موجود تھے۔جہاز نے اُڑان بھری تو اب سمجھے کہ ماریشس پہنچ گئے۔ماریشس کا سفر بمبئی سے چھ گھنٹے کا ہے۔ڈیڑھ گھنٹے کا فرق وقت میں ہے۔پھر ناشتہ،سونا،فلم اور گیارہ

بجے جہاز نے موریشس پر لینڈ کیا۔ بہت سے لوگ ہمیں لینے آئے تھے۔ پروفیسر شمیم حنفی، اخلاق اثر اور ابوالکلام قاسمی سب سے گھل مل کر مل رہے تھے کہ یہ ان لوگوں کا دوسرا پھیرا تھا۔ عنایت حسین عیدن، صابر گوڈر، مریم گوڈر، نصیب صاحب، قاسم صاحب ہمارے میزبان تھے۔ ہمارے ساتھ لکھنؤ کے میئر گپتا جی اور ان کی بیگم صاحبہ بھی تھیں۔

گپتا جی بہت باغ و بہار انسان ہیں، اردو بہت اچھی جانتے ہیں۔ انھوں نے کانفرنس میں جو پرچہ پڑھا اس کا موضوع تھا اردو اور سیکولرازم۔ اور مشاعرہ تو انھوں نے لوٹ لیا۔ بہت خوبصورت عاشقانہ غزلیں لکھتے ہیں۔

پھر ایک بڑی سی وین میں بیٹھ کر ہم لوگ ہرے بھرے علاقوں سے گزرتے، پرسکون سڑکوں سے ہوتے، تروتازہ ہوا کے ساتھ اور ایک خاص طرح کی بھینی بھینی خوشبو کے احساس کے ساتھ ہم Curepipe شہر کے Continental ہوٹل پہنچے۔ سب کمروں کی چابیاں دے دی گئیں۔ اور سب اپنے اپنے کمروں میں۔

ارے ہاں بمبئی سے جناب جاوید خاں، منسٹر آف ہاؤسنگ، گورنمنٹ آف مہاراشٹر بھی وفد میں تھے۔ جناب شفیع قریشی، گورنر آف بہار وفد کے لیڈر تھے اور بیکل اُتساہی صاحب، ایم پی تو تھے ہی۔ یہ الگ ہوٹل میں ٹھہرائے گئے تھے۔

ہمارے میزبان حضرات نے اطلاع دی تھی کہ اسلامک انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے چار بجے گارڈن پارٹی ہے چنانچہ کمروں میں جا کر تھوڑی دیر دم لے کر کھانا کھا کر تیار ہوئے اور پارٹی کے لیے روانہ ہو گئے۔ جہاں عمائدین ملک بھی تھے اور اکابرین ملک بھی، ملک کے خادم بھی اور حاکم بھی۔ خواتین بھی اور بچے بھی۔ بس پارٹی، موسم کی خرابی کی وجہ سے گارڈن سے ہال میں منتقل ہو گئی تھی۔ سب لوگ بہت خوش تھے، چہرے اس طرح کھلے ہوئے تھے کہ زبان سے خوش آمدید کہے بغیر ہم لوگ سمجھ رہے تھے کہ ہمارے میزبان واقعی ہمارے آنے سے خوش ہیں۔ خواتین گجراتی لباس میں بھی تھیں۔ بعض مغربی لباس میں تھے۔ زیادہ تر شلوار قمیص میں۔ غرض اس مجمع میں سب اپنے لگ رہے تھے۔ ہندوستانی وفد کے لیڈر جناب شفیع قریشی نے پہلی ہی تقریر میں موریشس کے لوگوں کے دل جیت لیے۔ جناب بیکل نے بھی تقریر کی اور بھوجپوری میں اشعار سنائے۔ یہاں کے لوگ آپ سے بہت اچھی طرح واقف تھے۔ خواتین کی نمائندگی بیگم حبیب اللہ نے کی اور اندرا گاندھی کی تقریر کی یاد دلا دی اور اس طرح پہلی تقریب میں ہندوستانی وفد نے موریشس کو اور موریشس نے ہندوستانی وفد کو اپنا لیا۔ اب موسم کھل گیا تھا۔ ذرا بلندی پر ایک وسیع لان میں چائے کا انتظام تھا۔ خواتین ہندوستان کے بارے میں طرح طرح کے سوال کر رہی تھیں، جس میں اشتیاق بھی تھا تجسس اور اپنائیت بھی اور یہ انداز کہ ؎

کس حال میں ہیں یارانِ وطن

موریشس کی بول چال کی زبان کریول ہے، سرکاری زبان انگریزی ہے۔ فرانسیسی بھی سمجھی جاتی ہے۔ ہندی، اردو بھی سبھی تھوڑی بہت بول لیتے ہیں۔ خواتین ہندی ہی میں یا یوں کہیے کہ اردو ہی میں بات کر رہی تھیں۔ اس پارٹی میں دو چار

نوجوان خواتین آگے بڑھیں اور ہم سے پوچھنے لگیں کہ ''یوسف بھائی کیوں نہیں آئے۔'' چند لمحوں کو تو ہم چکرائے کہ مطلب دلیپ کمار سے ہے، یاد آیا کہ موصوف سے متعلق ایک کتابچہ بھی اس تقریب میں تقسیم ہوا تھا۔ اخبار میں یہ بھی دیکھا تھا کہ وہ بھی ورلڈ کانفرنس میں جا رہے ہیں اور پھر بیماری کی خبر بھی آئی تھی۔ ہم فوراً سنبھل گئے بولے،'' جی وہ تو آنا چاہتے تھے بہت شوق تھا ان کو یہاں آنے کا مگر ڈاکٹروں نے آرام کا مشورہ دیا اس لیے۔۔۔'' اور سائرہ بھابھی،'' وہ کیسے آتی ان کو چھوڑ کر'' ہم نے فوراً کہا،'' اور کیا بھلا ان کو کون دیکھتا۔'' ایک معمر خاتون نے ہماری ہاں میں ہاں ملائی۔ پھر جو ہم مُڑے تو ہم نے دیکھا کہ اردو ترقی بورڈ کی فہمیدہ بیگم ہندوستان میں اردو کے فروغ اور ہر دلعزیزی کے بارے میں گفتگو کر رہی ہیں۔ بیگم حامدہ حبیب اللہ ہندوستان کی تہذیب و کلچر پر روشنی ڈال رہی ہیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، ولی محمد شاہین سے کینیڈا میں اردو کی صورتِ حال پر گفتگو کر رہے تھے، عابد رضا بیدار اس مسلئے پر گفتگو کر رہے تھے کہ موریشس میں کس طرح کتابیں بھجوائی جائیں اور موریشس میں اردو کے فروغ میں وہ کیا کر سکتے ہیں۔ گلزار نقوی بتا رہے تھے کہ ہندوستان میں آئی ہی سی ،آر تہذیب و ثقافت کے میدان میں کیا خدمت انجام دے رہا ہے۔ اشتیاق عابدی صاحب، گورنر صاحب ،منسٹر صاحب، ہمارے وفد کے لیڈر جناب شفیع قریشی صاحب، بیکل اُتساہی صاحب اور جاوید احمد صاحب منسٹر کے ساتھ بہت اہم لوگوں سے تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ خدا کا شکر ہے کہ وفد میں ہم موجود ہیں جو'یوسف بھائی' اور سائرہ بھابھی' کے متعلق استفسارات کا جواب دے سکتے ہیں۔

وہاں سے آکر پھر کسی ڈِنر میں جانا تھا جو مسٹر عبداللہ احمد نے دیا تھا جو اس کانفرنس کے روح رواں تھے اور نیشنل اردو انسٹی ٹیوٹ کے صدر بھی۔ ان کی بیگم صاحبہ بھی بہت متواضع خاتون ہیں۔ احمد صاحب کا گھر اس طرح روشنیوں سے سجا ہوا تھا جیسے ہمارے یہاں شادیوں میں سجایا جاتا ہے۔ کھانے کا انتظام شامیانے میں تھا۔ اس سے پہلے سب لوگ ایک بڑے سے ہال میں جمع ہوئے تھے۔ وہیں ہندوستان کے ہائی کمشنر رَینا سے ملاقات ہوئی جو گجرات کے ہیں اور ان کی بیوی راجستھان کی ہیں۔ دونوں خوش شکل خوش ادا اور بے حد کلچرڈ ہیں۔ اس کانفرنس کے انعقاد میں ان کی کوششوں کا بھی حصہ تھا وہاں رئیس احمد صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو ان دنوں وہاں کے تعلیمی معاملات کے سلسلے میں صلاح و مشورے کے لیے گئے ہیں۔ سلطان سرور صاحب جو پہلے ہی سے پاکستان میں مقیم تھے پاکستان کی نمائندگی کر رہے تھے ۔ابھی اور جگہ سے لوگ نہیں آئے تھے۔ سوائے کینیڈا کے شاہین صاحب کے۔ ہاں کھانے پر گئے تو دیکھا طلعت عزیز بھی مع اپنی بیگم صاحبہ کے'' بہت اہم لوگوں'' کی میز پر تھے اور ان کی آمد سے لوگ خوش نظر آرہے تھے۔ کھانا مزے کا تھا اور اس کے بعد مسٹر چونی ،منسٹر آف کلچر کی تقریر جنھوں نے اردو سے اپنی وابستگی کا حال بہت دلچسپ انداز میں بیان کیا کہ انھیں اردو نہیں آتی ہے مگر غزلیں سننا اچھا لگتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی ایک دوست کو غزل سرائی کی محفل میں لے گئے اور محفل

کے بعد انھوں نے اپنی دوست سے پوچھا ''کیسا لگتا ہے۔'' انھوں نے جواب دیا ''اچھا لگتا ہے۔'' اس کے بعد موصوف نے ان سے شادی کر لی۔ یہ انھوں نے اس انداز سے کہا کہ سب کو یہ فقرہ بہت پسند آیا اور ہم سب باری باری اسے دہراتے رہے اور یہی فقرہ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی نثری نظم کا عنوان تھا۔

''موریشس ہم کو اچھا لگتا ہے''

صاحبو ہے یوں کہ خاکسار کو دورانِ سفر مقامات اور مناظر سے کہیں زیادہ انسانوں اور ان کے رویوں سے دلچسپی ہے۔ دنیا اب سمٹ کر اتنی چھوٹی ہوگئی ہے کہ ملکوں کے عام حالات اور کوائف تو ایک جگہ بیٹھ کر ہی معلوم ہو سکتے ہیں۔ جغرافیائی اور تاریخی معلومات بھی فراہم ہونا مشکل نہیں ہے۔ بقول پروفیسر شمیم حنفی کہ وہ کہا کرتے ہیں جس جگہ کا سفر نامہ آپ لکھوائیں ہم سے، لکھوالیں، مگر ہم نے یہ ہمت اب تک نہیں کی۔ اس لیے کہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ اس میدان میں نہ آئیں۔ اب اڑچن یہ ہے کہ اب تک جو سفر اس خاکسار نے کیے وہ سب ذاتی نوعیت کے تھے۔ اس کے احوال میں ہم نے جو چاہا لکھا جو چاہا چھوڑا مگر یہ سفر ٹھہرا سرکاری۔ گورنر، منسٹر، ایم پی، ادیب، نقاد، محقق، نیم سرکاری اور نیم ادبی، نیم علمی لوگوں کا ساتھ۔ قدم قدم پر پکڑے جانے کا ڈر لاحق ہے۔ سو صاحبان انسان سرکاری سفر نہ کرے اور اگر کرے تو پھر سفر نامہ نہ لکھے یعنی ہم جیسا انسان۔ مگر ایک بات ہے کہ پروفیسر اشتیاق عابدی کا سرکاری، علمی اور معلوماتی سفر نامہ تو قارئین پڑھ ہی چکے ہیں، جنھوں نے اخبار میں نہیں پڑھا ہوگا تو اس کی وہ نقول پڑھ لی ہوں گی جو موصوف نے مختلف لوگوں کو از راہِ عنایت ارسال کی ہیں۔ سو ہمارے اس سفر کے احوال کو آپ اس کا دوسرا حصہ سمجھیں۔

ہاں تو ''موریشس ہم کو اچھا لگتا ہے۔'' اس کا اظہار و اقرار ہمارے گلزار نقوی نے مختلف انداز میں جس طرح کیا ویسا کسی نے نہیں کیا۔ گارڈن والی پارٹی میں شہر کی ایک متمول اور طرح دار خاتون سے فہمیدہ کی شناسائی ہوگئی تھی ان کا نام شاہدہ اور کام بزنس تھا۔ موریشس آنے والے ادیبوں، فنکاروں کی میزبانی کرنا ان کی ہابی تھی۔ چنانچہ سات تاریخ کو جب لنچ سے پہلے ہمارے ہوٹل میں گورنر صاحب اور کمشنر صاحب آنے والے تھے اور ایک میٹنگ ہوئی تھی۔ ہم ناشتے کے بعد مع فہمیدہ بیگم اور گلزار نقوی کے شاہدہ کے ساتھ نکل گئے۔ خلیق انجم، شمیم حنفی اور ابوالکلام قاسمی نے ہمارا ارادہ بھانپ لیا تھا اور پوچھا بھی کہ ''کہاں چلیں''۔ شمیم حنفی جانتے تھے کہ ہمیں ذرا موقع ملے گا تو ہم شاپنگ کو نکل جائیں گے مگر فہمیدہ بیگم ہمارے ساتھ ہیں، یہ دیکھ کر انھیں یقین آگیا کہ یقیناً ہم کوئی اہم اور سنجیدہ کام کرنے جا رہے ہیں۔ اس دن بازار بند تھے۔ اس حصّے میں بلکہ اس شہر میں جہاں شاہدہ ہم کو لے گئی تھیں بہت پوش علاقہ تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ سڑکیں صاف ستھری،، لوگ آجا رہے تھے مگر بھیڑ بھڑکا نہیں تھا۔ دھکم پیل نہیں تھی۔ ٹریفک کا شور نہیں تھا۔ خوبصورت اور صاف ستھرے بنگلے ٹائپ کے گھر تھے۔ ایک بڑی سی دکان کھلی تھی نہ جانے کیوں اس کے آگے پٹری پر بھی کچھ سامان کپڑا

munotes.in

ٹائپ بک رہا تھا۔ ہم دکان میں تھے تو ایک ادھیڑ عمر کے حضرت نے جو کوٹ پتلون میں ملبوس تھے ہم سے پوچھا’’ آپ اردو کی ورلڈ کانفرنس میں انڈیا سے آئی ہیں؟‘‘ ہمارا مارے خوشی کے بُرا حال ہوگیا۔ تو یہاں کے کاروباری لوگ بھی اردو کی ورلڈ کانفرنس اور انڈیا سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ پھر وہ ہم سے پوچھنے لگے کہ’’ انڈیا کے لوگ موریشس کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں۔‘‘ ہم نے کہا بہت اچھے، نہایت دوستانہ۔ ہم کو تو یہاں سب کچھ اپنا سا لگتا ہے۔ پھر تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اور وہ جلدی جلدی میں ہمیں طرح طرح کے کپڑے دکھانے لگے جو زیادہ تر باہر کے تھے۔ کچھ شاہدہ کے مشورے سے ہم نے خریدے بھی اور چلتے وقت ہم نے دکان کے مالک سے کہا،’’ اچھا شکریہ، اب تو آپ سے کانفرنس میں ملاقات ہوگی۔‘‘ بولے،’’ جی کانفرنس میں آنا تو مشکل ہے مگر طلعت عزیز کے پروگرام میں آئیں گے۔ غزلیں بہت اچھی لگتی ہیں!‘‘

شاہدہ چاہتی تھیں کہ ہم ان کے گھر جائیں کافی پئیں۔ مگر ہمیں ہوٹل پہنچنے کی جلدی تھی جہاں گورنر صاحب اور ہائی کمشنر صاحب پہنچنے والے تھے۔ چنانچہ ہم لوگ اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئے۔ کار شاہدہ کے بھائی ڈرائیو کر رہے تھے۔ راستے میں گلزار نقوی رطب اللسان تھے۔ موریشس کے حسن کا، میرا مطلب ہے قدرتی مناظر کے،’بہت اہم لوگوں‘ کی سادگی کے، عام لوگوں کی گرمجوشی کے اور ان کا خیال تھا کہ جہاں گیر کا وہ زبان زد خاص و عام شعر موریشس پر صادق آتا ہے ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است ہمیں است وہمیں است وہمیں است

فہمیدہ بیگم کی حب الوطنی کو ٹھیس لگی تو انھوں نے کہا کہ ایسے سب مناظر ہندوستان اور خاص طور سے ساؤتھ میں موجود ہیں، گلزار صاحب! شاہدہ نے موقع کو بھانپ لیا اور انھوں نے اونچے سروں میں ہندوستان کی تعریف شروع کردی اور کہا بھائی ہمارا اور آپ کا کیا مقابلہ! میں باہر دیکھ رہی تھی۔ ہم اب جہاں سے گزر رہے تھے ایک طرف تو کچھ جھونپڑی ٹائپ کے گھر تھے۔ کبھی کبھی ہرے بھرے گنّے کے کھیت آجاتے تھے، دوسری طرف لیچی کے باغ تھے۔ گھنے گھنے پیڑوں پر سُرخ سُرخ لیچیوں کے گچھے تھے اور باغ سے باہر سڑک کے کنارے عورتیں اور بچے بیچنے کے لیے لیچیاں لیے بیٹھے تھے جیسے دہرہ دون میں لیچی کے باغوں کے باہر بیٹھے ہوتے ہیں یا کشمیر میں سیبوں کے باغوں کے سامنے۔ ہم نے لیچیوں کی تعریف شروع کردی۔ اور شاہدہ حسنِ طلب کو سمجھ گئیں اور کریول میں بھائی صاحب سے گاڑی روکنے اور لیچی خریدنے کی فرمایش کی۔ لیچی کافی تندرست بھی تھیں اور میٹھی بھی۔ ہوٹل پہنچے تو میٹنگ شروع ہوچکی تھی۔ ہائی کمشنر صاحب موریشس کے بارے میں معلومات بہم پہنچا رہے تھے جسے اشتیاق عابدی صاحب ڈائری میں نوٹ کر رہے تھے۔ باقی سب لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ ہم بھی پیچھے کی کرسی پر ٹِک گئے۔

munotes.in

اس دوران رضا زیدی صاحب، انیس احمد صاحب کے ساتھ نمائش لگانے کی تیاری میں رہے۔ ان سے صبح تو نہیں مگر رات کے کھانے پر ملاقات ہوتی جس میں وہ موریشس کے لوگوں کی اردو سے دلچسپی، کیلی گرافی سے لگاؤ کا ذکر اپنے مخصوص دھیمے انداز میں کرتے جس میں گلزار نقوی زور پیدا کرتے رہتے۔

سات تاریخ کو چار بجے گورنمنٹ کے چیف وِھپ The Government Chief Whip مسٹر شوکت اللہ سودہان Shaukatullah Soodhun کی طرف سے وہاں کے ہیرالال دیکھی ہال میں کانفرنس کے مندوبین کا استقبالیہ تھا۔ یہ پورٹ لوئیس میں واقع ہے۔ یہ ایک دومنزلہ عمارت ہے۔ اس کے بہت بڑے ہال میں لوگوں کا مجمع تھا۔ خواتین، حضرات، بچے، نوجوان، لڑکے، لڑکیاں۔ انگلش میوزک آرکسٹرا کے ساتھ ہو رہا تھا۔ اب بہت سے چہرے جانے پہچانے لگ رہے تھے۔ سب سے سلام دعا ہوئی۔ اتنے میں جامعہ کے قمرالدین صاحب نظر آئے۔ انھوں نے چائے پر مدعو کیا۔ اتنے میں چیف وِھپ صاحب اور ہمارے گورنر منسٹر اور ایم پی صاحب آئے۔ تقریریں ہوئیں۔ اور بہت اہم لوگوں کو تحفے بھی ملے۔ اس محفل میں رونق اسی لیے زیادہ تھی کہ اس میں طلعت عزیز بھی موجود تھے۔

کانفرنس ۹ر دسمبر کو شروع ہونا تھی اور ہم لوگ تین دن پہلے پہنچ گئے تھے۔ کانفرنس کے منتظمین نے پروگرام اس طرح بنایا تھا کہ ہم لوگ تھوڑی دیر کو بھی خالی نہ رہیں اور یہ محسوس نہ کریں کہ ہمارا کوئی پُرسان حال نہیں ہے اور ہم دیارِ غیر میں ہیں۔ پارٹیاں، لنچ، ڈِنر سرکاری نیم سرکاری۔ ایک سے ایک پُرفضا مقام پر مناظر فطرت کا لطف، جذبات سے بھری ہوئی گرم جوش خطابت بھی، جنت نگاہ سامان بھی اور فردوس گوش کا بندوبست بھی۔ ۸ر تاریخ کو دوپہر کا کھانا بھی چیف وِھپ، مسٹر سودھان اور مسٹر اور مسز حیدر جوردان کی طرف Pereybere گرانڈ بے پر تھا۔ موریشس اپنے خوبصورت بیچوں کے لیے مشہور ہے۔ دو ایک بیچ ہم نے بھی دیکھے۔ چوڑے چوڑے ساحل اور دور تک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، سمندر میں بوٹنگ کرتے جوڑے، اس دن اتوار کی وجہ سے کافی چہل پہل تھی۔ واپسی میں ہم اس بیچ پر اُترے جہاں خواتین وحضرات بیچ کے روایتی لباس میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ زیادہ تر غیر ملکی تھے اور لگا تھا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں زیادہ تر انگریز اور فرانسیسی لوگ رہتے ہیں۔ خلیق انجم صاحب نے ان مناظر کو کیمرے میں محفوظ کرنے کا بندوبست کرلیا۔ فہمیدہ بیگم ساحل سے موجوں کا نظارہ کرنے کے بجائے پانی میں اُتر گئیں۔ شمیم حنفی صاحب نے ایک الگ کونا تلاش کیا اور فکرِ شعر میں بیٹھ گئے۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ واقعی وہ مشاعرے کے لیے نئی غزل کہنے کی فکر میں تھے۔ نارنگ صاحب بھی اس وقت سب علمی اور ادبی مسائل کو بھول کر ساحل سمندر کی تروتازہ ہوا سے محفوظ ہو رہے تھے۔ سید حامد صاحب بیگم حبیب اللہ سے محوِ گفتگو تھے۔ وہاب اشرفی صاحب 'اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی' والی کیفیت میں کھڑے رہے۔ عابد رضا بیدار صاحب کو مجمع میں رہ کر خلوت کا لطف اُٹھانے کا گُر آتا ہے وہ ایک فلسفیانہ استغراق کے ساتھ کھڑے تھے۔

munotes.in

غرض سوائے اشتیاق عابدی صاحب کے جو پھلوں کا عرق پی کر وین میں نیم غنودگی کے عالم میں تھے، سبھی اس فضا سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انداز اپنا اپنا تھا۔ وہاں سے واپسی میں بوٹینکل گارڈن گئے جہاں ہندوستانی لیڈروں کے ہاتھ کے لگائے پودے بھی تھے۔ وہاں ایک پیڑ ایسا تھا جس میں سو سال میں ایک دفعہ پھول آتا ہے اور خوش قسمتی ایک درخت پر بہت بڑا پھول لگا ہوا تھا۔ ایک حوض میں بڑے بڑے کنول کے ہرے ہرے پتّے تھے اتنے بڑے جیسے ایک بڑی سی سینی یا پرات ہو۔

ہمارے وفد کے لیڈر جناب شفیع قریشی نے ہر فنکشن میں تقریر کی۔ بعض بعض دن تو ان کو ایک دن میں تین تین بار بولنا پڑا۔ مگر کمال تھا کہ ہر دفعہ انھوں نے اپنی تقریر میں ایک نئی بات پیدا کی۔ ہر وہ بات اپنی تقریر میں لائے کہ موریشس کے لوگ ہندوستان سے خود کو بہت قریب محسوس کریں۔ دو تین دفعہ بیکل صاحب بھی بولے اور جاوید صاحب نے بھی دو ایک مرتبہ تقریر کی بلکہ کانفرنس میں مقالہ بھی پڑھا۔ اب اور مندوبین بھی آ گئے تھے۔ مثلاً ڈربن ساؤتھ افریقہ سے حبیب الحق انصاری، سعودی عربیہ سے نسیم اقبال صاحب، پاکستان سے جناب جمیل جالبی اور حسن عسکری صاحب، جو وہاں کی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری ہیں۔

۹ر دسمبر کو کانفرنس کا افتتاح ہوا۔ اس دن وزیر اعظم جلدی میں تھے۔ اس لیے کہ پارلیمنٹ میں موریشس کو ری پبلک بنانے کا بل پیش ہونے والا تھا۔ جمیل جالبی صاحب نے افتتاحیہ جلسے میں بہت اچھا خطبہ پڑھا۔ اس کے بعد کانفرنس تین دن تک جاری رہی۔ زیادہ تر مقالوں میں اس کا بیورا پیش کیا گیا کہ اردو کہاں کہاں بولی، پڑھائی اور سکھائی جاتی ہے اور اپنے اپنے ملکوں میں جہاں کی نمائندگی مندوبین کر رہے تھے وہاں اردو کی کیا صورت حال ہے۔ ادبی مسائل پر بھی گفتگو ہوئی۔ ساختیات اور تنقید پر بھی۔ آزادی کے بعد اردو ادب کی صورتِ حال بھی اور اردو کے سیکولر ہونے کا ذکر بھی رہا اور اس کی بین الاقوامی حیثیت بھی زیرِ بحث آئی۔ اردو کی ادبی روایات کی کلچرل بنیاد پر بھی اظہارِ خیال ہوا اور نئی غزل پر بھی۔ برّصغیر سے باہر ادب کی صورتِ حال کیا ہے اس پر روشنی ڈالی گئی۔ اردو کا اسٹیج، ٹی وی اور ریڈیو سے کیا رشتہ ہے، یہ بھی بتایا اردو اور ہندوستانی میوزک کے تعلق پر بھی مباحثہ ہوا۔ اردو ادب کی صورتِ حال موریشس میں کیا ہے، اس پر وہاں کے نوجوان شاعر صابر گوڈر نے روشنی ڈالی۔ اردو اکیڈمیوں کا اردو کے فروغ میں کیا رول ہے اس کا خاکہ جناب اشتیاق عابدی نے پیش کیا۔ فرانس کے پروفیسر ایلن نے فارسی کی ان کہاوتوں پر دلچسپ گفتگو کی جن کا رشتہ مذہب سے ہے اور جو آج کل اردو میں بولی جاتی ہیں۔ پروفیسر شاہین نے کینیڈا میں اور پروفیسر نسیم اقبال نے سعودی عرب میں اردو کی صورتِ حال پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر حبیب الحق انصاری جو ڈربن (جنوبی افریقہ) سے آئے تھے اور ڈربن یونیورسٹی میں شعبۂ عربی و فارسی کے پروفیسر ہیں، انھوں نے نہ صرف جنوبی افریقہ میں اردو کی صورتِ حال کا جائزہ لیا بلکہ اس کے

اعداد و شمار جمع کیے کہ دنیا میں کہاں کہاں اردو بولی، سمجھی اور پڑھائی جاتی ہے۔ تین دن کانفرنس کے سارے سیشن بہت کامیاب رہے، اس معنی میں کہ مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ کا وسیع و عریض ہال لوگوں سے بھرا رہا۔ ان میں وہ اساتذہ بھی تھے جو اردو پڑھاتے ہیں، وہ بھی جو اردو پڑھانا سکھاتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو اردو بولتے اور سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ موریشس میں زیادہ سے زیادہ اسے فروغ ہو۔

حبیب الحق انصاری کے والد جامعہ کے پرانے طالب علم نکلے۔ یہ ارشاد الحق صاحب اور پروفیسر عبدالعلیم کے کلاس فیلو تھے۔ ان کا نام منصور الحق تھا اور انھوں نے ڈاکٹر ذاکر حسین کے ساتھ کام بھی کیا تھا۔ اِن سے جامعہ کے بارے میں گفتگو رہی۔ کانفرنس کے دوران چائے اور کھانے کے دوران لوگ الگ الگ باہر سے آئے مہمانوں سے گفتگو کر کے ان سے اپنے مسائل بیان کرتے۔ پروفیسر ایلن بہت دلچسپ انسان ہیں۔ پیرس یونی ورسٹی میں اردو پڑھاتے ہیں۔ بہت شستہ اور بامحاورہ گفتگو کرتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا آپ نے سیریل دیکھے جو غالب اور ٹیپو سلطان پر بنے ہیں جو آئی، سی، سی، آر نے یہاں بھیجے ہیں اور یہاں کے ٹی وی پر دکھائے جا رہے ہیں۔ بولے، ''جی ہاں آپ کا مطلب سلسلے وار کہانی سے ہے۔'' انھوں نے میرے لیے جگہ خالی کی۔ میں نے کہا تھینک یو۔ جواب ملا، ''جی اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں یہ تو ہمارا فرض ہے کہ خواتین کا احترام کریں۔'' میں نے ایک دن، رات کو کھانے سے واپسی پر کہا۔ موسم کس قدر Pleasant ہے۔ بولے، ''جی ہاں، بجا فرمایا۔ نہایت خوشگوار موسم ہے۔'' اور دس تاریخ کو رات کو کھانے پر ایک دم روس کی لُدمیلا آئیں تو ایسا لگا بہار آ گئی۔ دوسرے دن انھوں نے روس میں اردو کی صورتِ حال پر جب فصیح و بلیغ انداز میں گفتگو کی تو لوگ متحیر رہ گئے۔

مسٹر چونی نے جوڈنر دیا تھا۔ اس میں پاکستان کے حامد علی نے غزل خوانی کی۔ ان کی غزلیں سن کر استاد امانت علی یاد آ گئے اور جب انھوں نے وہ غزل گائی ع انشا جی اُٹھو اب کوچ کرو، تو سننے والوں کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

کانفرنس کے آخری اجلاس میں محترمہ گرجا ویاس، منسٹر آف انفارمیشن اور براڈ کاسٹنگ بھی آ گئیں اور انھوں نے بہت اچھی اردو اور شاعرانہ زبان میں پُر اثر تقریر کی۔ اس شام ابوالکلام قاسمی سب مندوبین سے یہ پوچھتے ہوئے پائے گئے کہ ''مجھے معلوم ہے آپ شعر کہتے ہیں۔'' پہلے تو ہم کچھ نہ سمجھے کہ یہ کیا قصہ ہے جب انھوں نے یہ سوال کیا ہم سے بھی، تو معلوم ہوا کہ انھیں رات کے مشاعرے کے لیے شاعر چاہئیں کیونکہ ہمارے ساتھ مستند اور مشاعرے لوٹنے والے ایک ہی شاعر تھے جناب بیکل۔ مگر رات کو جب ہم مشاعرے میں پہنچے تو ہال سامعین اور اسٹیج شاعروں سے بھرا تھا۔ صدارت محترمہ گرجا ویاس کی تھی اس کے علاوہ مسٹر چونی اور گورنر صاحب بھی تھے۔ ہندوستان کے شاعروں میں بیکل صاحب کے علاوہ سید حامد، پروفیسر نارنگ، شمیم حنفی، صغیر الحسن اور گپتا جی تھے۔ کینیڈا کی نمائندگی شاہین صاحب کر رہے تھے جو ایک

مشہور شاعر ہیں اور کینیڈا میں اردو کے فروغ کے لیے اَن تھک محنت کرتے ہیں۔ مقامی شاعروں میں قاسم ہیرا اور صابر گوڈر تھے۔ داد دینے کا کام حسبِ معمول بغیر کسی ہدایت یا فرمائش کے ہم نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اور اسے سب سے زیادہ اہمیت گپتا جی نے دی کہ زیادہ سے زیادہ شعر سنا کر محفل کو زعفران زار بنا دیا۔ ایک خاتون جو ہمارے پیچھے بیٹھی تھیں بولیں، ''مجھے اردو کم آتی ہے مگر ان کی شاعری میں سمجھ گئی اور بہت ہنسی آئی۔''

بارہ کی دوپہر کو ہماری روانگی تھی۔ اس دن پورٹ لوئس میں واقع اردو انسٹی ٹیوٹ جانا تھا جو ایک طرح کا اردو مرکز ہے۔ اس کے سرپرست جناب احمد صاحب ہیں اور اس کی روح رواں جناب عنایت حسین عیدن ہیں جو علی گڑھ کے پڑھے ہوئے ہیں اور اچھے ڈرامے اور کہانیاں لکھتے ہیں۔ موریشس میں شاعری اور ڈرامے دونوں کا بہت زور ہے۔ عنایت حسین عیدن تفصیل سے ہمیں یہاں اردو کے فروغ میں جو اُلجھنیں ہیں اور وہ ان سے کس طرح نمٹتے ہیں، بہت انکسار سے بتا رہے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ ابوالکلام قاسمی صاحب، شمیم حنفی صاحب اور انیس احمد صاحب رک رہے ہیں۔ انھیں موریشس میں کچھ اور کام نمٹانے تھے۔ ہوٹل آ کر جلدی جلدی سامان سمیٹا اور ائیر پورٹ کی طرف چل دیے۔ اب دل میں اشتیاق اور تجسس کے بجائے لوگوں کی محبت کا احساس تھا اور موریشس کے حسین مناظر دل پر نقش تھے۔ یہاں اردو زبان کے وسیلے سے جو رشتے قائم ہوئے تھے اس کی مسرت سے دل مالا مال تھا۔ اپنے ہی ملک کے لوگوں کے ساتھ وقت گزار کر ان کو قریب سے جاننے کا موقع ملا تھا اور ان سے ایک نئی شناسائی کا احساس تھا۔ وہاں جا کر ہمیں یہ معلوم ہوا کہ پروفیسر نارنگ صاحب جب چاہیں یا موقع ہو تو ایسے خاموش اور الگ تھلگ رہ سکتے ہیں جیسے وہ ہیں بھی اور نہیں بھی۔ خلیق انجم صاحب کو اپنی صحت اور انجمن کی فکر کہیں نہیں چھوڑتی۔ علاوہ علمی اور ادبی مسئلوں پر گفتگو کے (جو وہ کرتے ہی رہتے ہیں) وہ انجمن کے لیے لوگوں کی تنہا تصویر کھینچتے رہے اور ڈائٹنگ کے فوائد اور پھلوں کے استعمال پر گفتگو کرتے رہے۔ شمیم حنفی صاحب کس طرح غیر ملک کے لوگوں سے گھل مل کر ان کا حصہ بن سکتے ہیں۔ بیدار صاحب میں دانشوری کے ساتھ حس مزاح بھی ہے جو اپنی ساری لاتعلقی کے باوجود آس پاس ہونے والے مضحک واقعات پر محظوظ بھی ہو سکتے ہیں اور اس کا اظہار دبی زبان سے ایک آدھ فقرے سے کر دیتے ہیں۔ بیگم حبیب اللہ جن کا صرف نام سنا تھا ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا، ان کی نفاست و ذہانت اور فراست کے نمونے دیکھنے کو ملے۔ سید حامد صاحب ہیں ہر وقت، یہاں تک کہ ناگوار واقعات پر بھی زیر لب مسکرانے کی غضب کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ خیال خاطر احباب اس درجہ ہے کہ جب بھی بیگم حبیب اللہ ان کو اپنے ساتھ کھانے کی میز پر لکھنوی انداز میں بُلاتیں تو اپنے ساتھیوں اور ضروری گفتگو کو چھوڑ کر مسکراتے آ جاتے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ بیگم صاحبہ اس دوران بہت اہم لوگوں کی میز پر چلی گئیں، تب بھی حامد صاحب ہم جیسے چھٹ بھیوں کے ساتھ خلیق انجم صاحب کو چھوڑ کر بیٹھے رہے۔ ان میں کس قدر صبر، کس قدر وقار ہے اور ان سے مل کر

بھلا کون ہے جو یہ شعر نہیں پڑھے گا ؎

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں بہت جی خوش ہوا حامد سے مل کر

(حالی کی جگہ حامد ہم نے کر دیا کہ لوگ موریشس جا کر با قاعدہ شاعر بن گئے، ہم تصرف بھی نہ کریں۔)

ہمیں موریشس میں اتنے دن میں قدم قدم پر وہاب اشرفی صاحب کی حب الوطنی کا اندازہ ہوا کہ وہ وہاں ایک منٹ کو ہندوستان کو نہیں بھولے اور اپنے بچوں اور بیوی کو بھی یاد کرتے ہیں۔

رضا صاحب بہت سنجیدہ آدمی ہیں۔ کم گو، یہ ہم جانتے تھے مگر معلوم ہوا کہ نہیں، یہ کبھی کبھی سنجیدگی سے غیر سنجیدہ باتیں دیر تک کر لیتے ہیں اور اس کا اعتراف بھی ہم کر لیں کہ ابوالکلام قاسمی صاحب کے بارے میں ہمیں کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوئی اور ہاں ہمیں وہاں جا کر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ فہمیدہ بیگم سب سے الگ تھلگ کیوں رہتی ہیں اور وہ اتنی سنجیدہ نہیں ہیں جتنی نظر آتی ہیں۔ وہ ہنس بھی سکتی ہیں اور کئی مرتبہ انھوں نے ہمارے ساتھ قہقہے لگائے! تو حضرات جب ہم ہوٹل سے چلے تو ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پھول کھلے تھے پات ہرے تھے اور ہم سب اپنے وطن ہندوستان جنت نشان کی طرف رواں دواں تھے۔

نوٹ: اس کانفرنس میں جناب ہرچرن چاولہ بھی تھے اور ناروے سے آئے تھے اور وہاں اردو کی کیا حالت ہے اس پر مقالہ بھی پڑھا تھا۔

☆☆☆

munotes.in

munotes.in